۱۹۵۸ء کے بہترین افسانے

مرتبہ

ایم۔ حبیب خاں

۱۹۵۸ء کے بہترین افسانے

مرتبہ

ایم۔ حبیب خاں

ملنے کا پتہ

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

مکتبہ شاہراہ

شائع ہونے والے تقریباً ہر اخبار اور رسالے کو کھنگالا اور ان کا جائزہ لیا اور اس انتخاب کو ہر اعتبار سے نمایندہ بنانے کی کوشش کی ہے راجندر سنگھ بیدی ہندو پاک کے مشہور افسانہ نگار ہیں۔ ان کا افسانہ "اپنے دُکھ مجھے دیدو" تقسیم کے بعد دوسرا افسانہ ہے۔ اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یہ افسانہ نہ صرف ۱۹۵۵ء کا بہترین افسانہ ہے بلکہ اُردو کی چند بہترین اور معنی خیز افسانوی تخلیقات کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ میں اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں یہ دیکھنا اب آپ کا کام ہے۔

اس انتخاب کے سلسلے میں مجھے اپنے ان افسانہ نگاروں کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جن کے افسانے اس میں شامل ہیں اور جنھوں نے باوجود اپنی مصروفیتوں کے نہ صرف میرے ساتھ تعاون فرمایا بلکہ اپنے افسانوں کی اشاعت کی منظوری سے بھی مجھے نوازا جن افسانہ نگاروں نے اپنے افسانے شامل کرنے کی اجازت نہیں بھیجی افسوس ہے ان کے افسانے اس میں شامل نہیں کئے گئے۔

اس کے علاوہ اس انتخاب کے سلسلے میں مجھے اپنے شفیق دوست جناب نادر علی خاں صاحب اُستاد شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جنھوں نے ہر قدم پر میری رہنمائی اور ہمت افزائی کی ہے۔

آخر میں مجھے اپنے کرم فرما ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی جو اُردو دنیا میں سنجیدہ و متوازن نقاد اور خوش گو شاعر کی حیثیت سے ممتاز اور معروف ہیں شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میں ڈاکٹر صاحب کا بے حد ممنون ہوں کہ موصوف نے اپنا قیمتی وقت نکال کر اس انتخاب کو پڑھا اور اس پر نہ صرف اپنی رائے دی بلکہ انتخاب کی داد اور میری حوصلہ افزائی بھی فرمائی۔

ایم۔ حبیب خاں

انجمن ترقی اُردو ہند
علی گڑھ۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۶۰ء

گھڑی میں ٹائم دیکھا ـــــ پورچ کی دھندلی روشنی میں رضیہ خطرناک حد تک حسین اور معصوم نظر آ رہی تھی۔

"ایسی پیاری صورت پر تو کوئی بھی آسانی سے عاشق ہو سکتا ہے" بڑی بیگم نے گھبرا کر سوچا اور ان کی نگاہوں کے سامنے ایک ہیولا سا ابھر آیا ـــــ اونچا قد ـــــ بڑے بڑے سنہرے بال ـــــ سفید قمیص ـــــ سفید پتلون ـــــ مسکراتا چہرہ ـــــ

بڑی بیگم اپنے کمرہ سے نکل آئیں ـــــ رضیہ بڑی متوالی چال چلتی اپنے کمرے کو جا رہی تھی۔

"سنو بیٹا ـــــ" انہوں نے ذرا بھاری آواز سے کہا۔ "جی" ـــــ رضیہ ٹھٹھک گئی۔

"تم اب تک کہاں تھیں ـــــ"

"بنے کے ساتھ ـــــ" وہ بڑی معصومیت سے بولی۔

"بنے ـــــ؟ بنے کون ـــــ؟ خالہ بھی نے حیرت سے پوچھا

رضیہ ہنس دی ـــــ" وہ اس دن جو آئے تھے نا ـــــ" پھر خالہ بی کے حافظہ میں یاد کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی ـــــ" وہ وہی اونچے اونچے سے ہیں میں نے جنہیں چائے پلائی تھی ـــــ ارے جو شاعر ہیں۔"

خالہ بی کو یاد آ گیا ـــــ ذرا تلخی سے بولیں "ـــــ کیا کر رہی تھیں اس کے ساتھ"

"شام غزل" کے نام سے ایک ادبی پروگرام ہونے والا ہے، سارا دن اسی گورکھ دھندے میں ختم ہو گیا ـــــ اف کس بری طرح تھک گئی ہوں ـــــ" وہ پاؤں جھٹکتے ہوئے بولی۔ مگر اس کے چہرے پر تھکن کے کوئی آثار نہ تھے۔

بڑی بیگم نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور آہستہ سے بولیں۔

"تم خود سمجھدار ہو بیٹی"

⁂

اشرف میاں کو بیٹی سے اتنا ہی سروکار تھا کہ اس کے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کا، ہر ہر بات کا خیال رکھیں نہ یہ سوچیں کہ جوان لڑکی اکیلی کدھر آتی جاتی ہے نہ یہ دیکھیں کہ بن بہار کے یہ گالوں پر گلاب کیوں کھل رہے ہیں ـــــ جہاں کسی چیز کی ضرورت پڑی یہ باپ کی بیٹھک سے جا کھڑی ہوئیں اور باپ نے جھٹ چیک کاٹ دیا۔ پھر یہ نہ پوچھیں کہ "بیٹا یہ ضرورت کیوں پڑتی ہے۔ـــ" بس بٹیا کا دل نہ ٹوٹ جائے۔

"بیٹے تو خود ہی پڑھ لکھ کر کمائی کرتے ہیں انہیں کیا روپے پیسے کی ضرورت ہے۔ ـــــ ہاں بیٹیوں کا دل نہ توڑنا چاہیئے ـــــ"

کبھی تو منہ اٹھا کر نہ پوچھا کہ بیٹا تم کن گلیوں کے چکر کاٹتی ہو"؟

رضیہ بی کے واحد غم خوار اور راز دار جنو میاں تھے۔ کالج سے لوٹ کر گھر پر جو بھی ٹائم گزرتا انہیں کی صحبت میں ـــــ بڑی بیگم ایک دن باہر تخت پر بیٹھی آلو چھیل رہی تھیں اندر رضیہ اور جنو میں باتیں ہو رہی تھیں ـــــ

" اچھا بتایئے جی جنو راجہ ـــ آپ نے اب تک اسکول میں کیا کیا پڑھا ہے"

" اب آپ کو سارے کا سارا کیسے بتائیں ـــ آپ کچھ پوچھئے تو جواب دیں!"

" اچھا کیوپڈ کے بارے میں کچھ پڑھا ہے ؟"

"کیوپڈ؟" جنو کی حیرت بھری آواز خالہ جی کے کانوں سے ٹکرائی۔

" ہاں ہاں کیوپڈ ـــــ جو اندھا ہوتا ہے اور بس پیٹھ پر ترکش بھرے تیر پر تیر چلاتا پھرتا ہے۔"

جانے کیا بک رہی ہیں آپ، وہ جھنجھلا کر بولا" تو وہ بن بات تیر کیوں چلاتا رہتا ہے"؟

"بس" یوں ہی، رضیہ ہنسنے لگی۔

"کچھ بتاتی تو ہیں نہیں بس ہنسے جا رہی ہیں میں کیا سمجھوں"؟

بہت دیر تک رضیہ کی کھنکھناتی آواز آتی رہی، پھر بڑی شگفتگی سے بولی۔

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

"سُن چنّو لوگ کہتے ہیں وہ جو کیو پڈ ہوتا ہے نا۔ تو بس کسی کے دل پر بھی تیر چلا دیتا ہے۔ چاہے بوڑھا ہو جوان ہو ـــــ لڑکا ہو کہ لڑکی ....."

بڑی بیگم نے بڑی ناگواری سے اس کے کمرے کی طرف دیکھا ـــــ چنّو بڑی معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

"کہیں آپ کے دل پر تو تیر نہیں لگ گیا۔" اس کی آواز میں ہلکا سا خوف چھایا ہوا تھا۔

رضیہ سنجیدہ ہو گئی۔ "وہی میں بھی سوچ رہی ہوں چنّو۔ جانے سردی کا اثر ہے یا کیا ہے ـــــ ان دنوں سینے میں درد ہوتا رہتا ہے۔"

"وکس لاؤں۔" چنو باہر دوڑنے لگا۔

رضیہ ارے رے کرتی رہ گئی مگر چنو باہر دوڑ گیا۔ بڑی بیگم کچھ سمجھیں کچھ نہ سمجھیں ـــــ مگر ٹوہ لینے کو دوسرے دن ناشتہ کی میز پر بولیں۔

"ہاں بیٹا تم ڈاکٹر کے ہاں کیوں نہیں چلی جاتیں۔؟"

"کس لئے" رضیہ حیرت سے بولی۔

"تمہارے سینے میں تکلیف جو ہے۔ رات تم چنّو سے ذکر بھی تو کر رہی تھیں نا؟"

رضیہ کو ہنسی آ گئی۔ "نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ اٹکتے اٹکتے بولی۔

اشرف میاں نے اپنے چشمے کے اوپر سے جھانکتے ہوئے کہا۔ "نہیں بیٹا اگر کوئی تکلیف ہے تو جلدی سے دوا منگوا لو۔ بیماری میں ڈھیل دینی ٹھیک نہیں۔"

بڑی بیگم کی عجب مصیبت تھی۔ رضیہ بی کے رنگ بتاتے تھے کہ وہ کچھ کر گزریں گی۔ اور بابا ایسے تھے کہ ہر طرف سے بے فکر ـــــ اگر کچھ منہ ہلاتی ہیں تو رضیہ بی منہ پھلا لیں گی۔

"بھئی یہ کون ہوتی ہیں مجھے ٹوکنے والی۔"

بات ٹھیک بھی تھی سگے باپ نے جب ڈھیل دے رکھی تھی تو یہ تیسرے کونے کدھر کہنے سننے کی حق دار تھیں۔ لاکھ خالہ جانی تھیں مگر تھیں تو پرائی سی ـــــ باپ جو سر پر موجود تھے ـــــ مگر آنکھوں دیکھتے ان سے صبر بھی نہ ہوتا تھا۔ ـــــ کچھ نہ کچھ

ضرور ہو کر رہے گا۔" انہوں نے گھبرا کر سوچا ـــــ خدا خیر ہی کرے جوان بیٹی کا معاملہ ہے۔ اور یہ کم بخت گھرانہ ایسا ہے۔ کہ نہ پردے کی قید نہ کہیں جانے آنے پر پابندی ـــــ ورنہ کہیں یہ بھی کسی نے سنا ہے کہ جوان بیٹیاں خود موٹریں اڑاتی پھر رہی ہوں۔ مشاعروں میں کھلے بندوں شرکت کر رہی ہوں ـــــ اور موٹر کے دروازوں میں سر ڈال ڈال کر کہتی ہوں ـــــ "آپ کی نظم تو واقعی سب پر چھا کر رہ گئی تھی۔"

بڑی بیگم کو بس آجا کے یہی حل سوجھا کہ بی رضو کے ہاتھ پیلے کر دیں۔

انہی دنوں ایک جج صاحب نے اپنے لڑکے کے لئے رضیہ کو مانگا بھی تھا۔ بڑی بیگم کو دھن لگ گئی کہ جس قدر جلد یہ کام سلجھ جائے بہتر ہے۔ ـــــ رضیہ کی موجودگی میں ایک دن کھانے کی میز پر قصداً انہوں نے یہ ذکر چھیڑا۔

"جج صاحب کے بیٹے کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے۔"

اشرف میاں نے ہاتھ روک کر حیرت سے دیکھا اور بولے۔ "ابھی سے؟ بھلا اتنی جلد؟"

"اے لو۔ اسے جلدی کہتے ہیں۔ بیس کی ہونے کی تو سوچ رہی ہیں صاحبزادی اور باپ کہتے ہیں ابھی سے؟"

"مگر پھر بھی اسے تعلیم تو پوری کر لینے دو۔ بی اے کا آخری سال ہے۔ کم از کم گریجویٹ تو ہو لے۔"

"اونہہ تعلیم کا کیا ہے ـــــ شوق ہے تو شادی کے بعد بھی پڑھ لے گی۔"

رضیہ نے بھنا کر بڑی بیگم کو دیکھا۔

"ابھی بچہ ہے۔" باپ بول رہے تھے۔

"بچہ ہے" بڑی بیگم حیرت سے بولیں۔ "ابھی شادی کر دو تو اس بچے کو بچہ ہو جائے۔ ہونہہ۔" انہوں نے تیزی سے چمچا پٹخا ـــــ "ہر باپ کو اپنی بیٹی سدا بچہ ہی نظر آتی ہے۔"

رضیہ نے نوالہ ہاتھ میں تھامے تھامے بڑی لاپروائی سے کہا۔ "ابھی تو میں بی اے کروں گی۔"

بڑی بیگم کے ہاتھ کا نوالہ بھد سے رکابی میں جا گرا اور سالن کی سرخ سرخ چھینٹیں ان کے کرتے پر بکھر گئیں۔ (دوئی یہ کیسی بیٹی ہے کہ اپنے منہ سے شادی کے معاملہ میں دخل دے رہی ہے۔؟")

اشرف میاں نے اتنی بڑی بات پر سنجیدگی سے غور ہی نہ کیا۔۔۔۔ بڑی متانت سے بولے

"ٹھیک ہی تو کہتی ہے ۔۔۔!"

ادھر رضیہ بی کو باپ کی شہ کیا ملی کہ ایک کھلے خزلنے بی اے کی اسٹیڈی ہونے لگی۔ گھر رگھر کرتی موٹر رکتی اور ایک دروازے سے ننّھے میاں اور ایک دروازے سے رعنو بی ۔۔۔۔ ڈرائنگ روم میں شعر و شاعری پر مباحثے ہوتے۔ ادبی بحثیں چھڑتیں۔ نظمیں غزلیں پڑھی جاتیں۔ اور چائے پی جاتی۔۔۔۔ بڑی بیگم نے اپنے منہ میں ہونٹ بھر لئے ۔۔۔۔ کوئی سنتا ہی نہیں تو بولیں بھی کس سے؟

ایک دن رات کے آٹھ بجے جب میز لگ چکی تھی اور سب کھانا کھانے میں مشغول تھے کہ تار والے نے آواز دی ۔۔۔۔ بڑی بیگم کا جی اڑنے لگا۔ اور اشرف میاں منہ کھولے تار کے مضمون کا انتظار کرنے لگے۔

"بڑے بھائی صاحب اور بھائی جان پاکستان سے آج سے چوتھے روز یہاں پہنچ رہے ہیں۔" رضیہ نے پڑھ کر سنایا۔

جمال میاں اور حامد میاں کے یوں یکا یک آنے کی غرض و غایت کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھی مگر پھر بھی گھر بھر میں خوشی سی پھیل گئی۔ باپ نے علی گڑھ تار کروا دیا کہ کچھ دنوں کے لئے چھوٹے بیٹے بھی آجائیں۔ پھر بھلا پاکستان سے روز روز کون آتا ہے۔ یہاں تو پرمٹ اور ویزا کی جھنجٹ ہی مہینوں تک ختم ہونے میں نہیں آتی۔

جمال میاں حامد میاں آئے تو ان کی بیبیوں بچوں سے گھر میں ہنگامہ مچ گیا۔

بڑی بیگم گھنٹوں دونوں بھائیوں سے سر جوڑے باتیں کرتی رہتیں۔ اب کہیں جا کر ان کا دل ہلکا پڑا۔

یوں تو دونوں بھائی کوئی آٹھ ماہ کا پرمٹ بنوا کر ہندوستان آئے تھے اور ابھی جانے کو تو دن پڑے تھے مگر چاہتے یہی تھے کہ جلد سے جلد بہن کی شادی طے ہو جائے ـــــ پھر کون جانے بعد میں طے ہونے پر شامل ہو سکیں نہ ہو سکیں!

جج صاحب کے بیٹے کے علاوہ اور بھی دو چار پیام نگاہ میں تھے۔ اس لئے غور و خوض ہونے لگا کہ بی رضو کو کس کے ساتھ بیاہا جائے۔ ادھر بی رضو تھیں کہ شاعر میاں کے ساتھ جنم کرم بتلانے کے بارے میں قطعی طور سے طے کر چکی تھیں، جان پر کھیل جاتیں مگر کسی اور کا ہاتھ نہ تھامتیں۔ جمال میاں ان سے بڑے ضرور تھے مگر روشن خیال گھرانوں میں جو بے تکلفی ہوتی ہے۔ وہ بھی یہاں بہن بھائی میں موجود تھی ـــــ بھائی نے ایک دن بات شروع کی ـــــ "رضو تم جانتی ہو، ابا میاں بوڑھے ہو رہے ہیں ـــــ پچھلی بار جب میں ہندوستان آیا تھا تب سے اب تک ان کی حالت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس پر امی جان کی موت نے الگ اثر کیا۔ ـــــ موت زندگی کا کیا بھروسا ہے۔ خالہ بی اپنے گھر کی ـــــ ہم رہے پاکستان میں ـــــ بھئی تم اپنی شادی کر ڈالو تا ایسے موقعے پر ہم بھی موجود ہیں۔ دراصل ہم اسی لئے آئے ہیں۔ کہ تمہاری شادی کر دیں۔"

("ہوں ـــــ تو خالہ بی نے بلوایا ہوگا"!) رضیہ نے منہ سے کچھ نہ کہا۔ بس بھائی کو دیکھتی رہی۔

"ایک جج صاحب کے صاحبزادے ہیں، ایک وہ پروفیسر ہیں اور ایک پھوپی اماں کے بیٹے ـــــ تم خود بھی پڑھی لکھی ہو عقل رکھتی ہو دنیا برا بھلا سمجھتی ہو۔ تم کس کو اپنے لئے مناسب سمجھتی ہو۔؟"

"اگر مناسب سمجھنے کا سوال ہے تو پھر میں بنّے سے شادی کروں گی۔" رضیہ نے معصومیت سے جواب دیا۔

"بنے سے؟" بھائی صاحب اپنی جگہ سے اچھل پڑے (خالہ بی نے آگے ہی شاید بہت کان بھر دیئے ہیں) تیزی سے بولے۔ "بنے سے شادی کرکے کیا لوگی؟" رضیہ بڑی سادگی سے بولی۔ "وہی جو جج صاحب کے بیٹے سے لوں گی"۔

"کمال ہے"۔۔۔۔ وہ غصے سے بولے۔ "ابا میاں کی پوزیشن کا کچھ تو خیال کرو۔۔۔۔ وہ کتنے بڑے آدمی ہیں۔ ان کا اتنا بڑا نام اور صاحبزادی شادی کر رہی ہیں ایک شاعر سے جس کے پاس بیوی کو پالنے کے لیے کوئی مستقل آمدنی بھی نہیں۔۔۔۔ اس سے تو شادی کرنے سے بہتر یہ ہے کہ ساری عمر کنواری ہی رہو"

"تو کیا میں اس کی آمدنی سے شادی کر رہی ہوں؟"

"سر پکڑ کر روؤ گی جب فاقے پڑیں گے تب پتہ چلے گا۔۔۔۔ ابھی ابا میاں سنیں گے تو گولی داغ دیں گے"۔

بڑے شاعرانہ انداز سے رضیہ بی بولیں۔ "مگر محبت کے سینے پر کون گولی داغ سکتا ہے!"

"اچھا۔۔۔۔" جمال میاں غصہ میں بھر کر بولے۔ "تو یوں کہئے کہ جناب کو محبت ہو گئی ہے شاعر اعظم سے!" رضیہ نے ناگواری سے بھائی کو دیکھا۔۔۔۔ "آپ مجھ پر جبر نہیں کر سکتے بھائی صاحب۔۔۔۔ مجھ میں اتنی ہمت تو یقیناً ہے کہ اپنا گلا آپ گھونٹ سکوں"۔

باپ کے کانوں تک پہنچتے دیر نہ لگی کہ صاحبزادی نے کونسا راستہ اختیار کر رکھا ہے۔۔۔۔ پٹھان خون جوش کھا گیا اور کانوں کی لویں سرخ پڑ گئیں۔

"ہم بھی سمجھ لیں گے صاحبزادی کتنے پانی میں ہیں"۔

مگر وہاں تو پتہ ہی نہ چل سکا کہ واقعی کتنے پانی میں ہیں۔ بھائیوں، بھاوجوں، بھتیجوں سے بات نہ چیت۔۔۔۔ گھر سے کالج اور کالج سے گھر۔ بس منہ لپیٹے پڑی ہیں۔ کہاں تو خالہ بی بجائے ماں کے تھیں یا اب اپنی خالی بی کی صورت زہر ہو گئی تھی۔

ایک دن کالج سے آکر یونہی پڑی تھیں۔ منہ اترا ہوا، آنکھیں کھنچی ہوئیں۔ چہرہ پر محرم برس رہے تھے جب سے بھائی صاحب سے بات چیت ہوئی تھی ادھر بنے میاں کا آنا جانا بالکل بند ہو گیا تھا مگر اس دن شام کو بنے میاں وارد ہو گئے۔ مرد لوگ تو کسی جگہ ملنے گئے ہوئے تھے۔ بس گھر میں عورتیں

ہی ہوتیں تھیں ـــــ رضیہ بی کی عید ہو گئی۔

وہ دوڑتی ہوئی پھاٹک تک گئیں۔ ڈرائنگ روم میں لا کر بٹھایا اور کرمن سے ـ کو کہہ دیا۔ چائے بن کر آئی تو انہوں نے خود اپنے ہاتھوں چائے پیالیوں میں انڈیل کر بنے میاں کے ہاتھ میں تھمائی۔

"کیا بات ہے، چہرہ اتنا اداس اور رویا رویا سا کیوں ہے تمہارا؟" وہ غور سے ان کے چہرے کو پڑھتے ہوئے بولے۔

رضیہ بی معصومیت سے بولیں "دیکھو نا یہ سب لوگ کہتے ہیں کہ میری شادی جج صاحب کے بیٹے سے کردیں گے۔ بھلا میں کیا کروں گی ان کے ساتھ شادی کر کے ـــــ صبح سے شام تک اس کنجوس بنیے کی طرح بس اشرفیاں گنتی رہوں گی کیا؟"

بنے میاں ہنس پڑے ـــــ ڈوم لینے کو چھیڑا ـــــ "تو ہوا کیا؟ اچھے امیر گھر پڑ رہی ہو۔ کر لو نا؟"

رضیہ نے بس آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ منہ سے کچھ نہ کہا۔ بنے میاں ا پنے آپ ہنستے رہے۔

خالہ بی کسی کام سے ادہر سے کچھ دیر بعد گزریں تو کمرے سے دھیمی دھیمی باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ سننا چاہا مگر کان تو بہرے تھے ـــــ اتنی دور کی بات بھلا کیا سمجھ آتی۔

دوسرے دن صبح انہوں نے، جب اشرف میاں اخبار لئے بیٹھے تھے۔ رات کی بات کہہ سنائی۔

"بنے میاں کل پھر آئے تھے!"

اشرف میاں کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

❁ ❁ ❁

جان چھڑکنے والے باپ کیا سے کیا ہو گئے کہ اب صورت تک دیکھنے کے روادار نہ تھے ـــــ یا تو ہر دن باہر جاتے ہوئے پوچھ جاتے تھے۔

"بٹیا کو کوئی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟"

"ہاں بھئی بٹیا کے لئے کیا لاؤں؟"

پھر شام کو واپسی پر ساتھ میں کبھی تو کپڑوں کا بنڈل لپٹا ہوتا ـــــ کبھی کتابوں کا پارسل ـــــ کبھی چاکلیٹ تو کبھی پھل ـــــ اب کہاں کے پھل اور کدھر کی مٹھائی ـــــ بڑی بیگم اور جمال میاں سے دو چار بار کہلوایا بھی ـــــ مگر وہ تو یونہی بند بنی رہیں ـــــ

"شادی تو بس بنے سے ہی کروں گی۔"

"بیٹی ذات کو اتنی شہ دینا مناسب نہیں، مگر ہم کہیں بھی تو سنے کون؟ رات بے رات دیر سویر گھر کو لوٹنا ـــــ چار پارٹیوں میں شریک ہونا ـــــ مشاعروں میں شرکت کرنا۔ غیر مردوں کے ساتھ گھومنا ـــــ یہ کوئی شریف بیٹیوں کے رنگ ڈھنگ ہیں۔ میں کہوں ایسی بھی کیا آزادی۔ اب بیٹھے ہیں نا ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے"۔

بڑی بیگم دونوں بہوؤں کے سامنے دل کے پھپھولے پھوڑتیں۔

گھر میں جدھر جاتے اُدھر ہی بھنبھناہٹ ـــ تنگ ہو کے اشرف میاں نے اعلان کر دیا ـــ

"میں نے جج صاحب کے ہاں حامی بھر دی ہے۔ شادی کی تیاری شروع کر دو"۔

گھر میں اِدھر جھم جھم پیتے گوٹے چمکنے لگے اور اُدھر چھم چھم آنسو بی رضیہ کی آنکھوں سے گرنے لگے ـــــ اسی دن پہلی بار اس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا اور یوں رو دھو کر انہوں نے ہار مان لی۔

اس دن کالج کی چھٹی تھی۔ رضیہ بی دن بھر سے اپنے کمرے میں ہی بیٹھیں۔ شام کو کوئی ساڑھے چار بجے اپنے کمرے سے باہر نکلیں۔ سفید ساڑی، سفید بلاؤز، چال میں ہم آہنگی، چہرے پر بھرپور اطمینان، یوں جیسے حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہو۔ اتنے دنوں سے آنے جانے پر پابندی تھی اور یوں بڑی بیگم سے بول چال بھی چھوٹ چکی تھی مگر اس دن قریب جا کر بولیں۔ "خالہ بی میں ذرا اپنی سہیلی کے ہاں جا رہی ہوں"۔

"کیوں؟" انہوں نے ساڑی پر نیا ٹانکتے ٹانکتے ہی پوچھا۔ "اس کا رسم ہو رہا ہے آج منگنی کا۔"

"دولہن تو کوئی ایسے خوشی کے موقعوں پر سفید ساڑی پہنا کرتا ہے، کوئی رنگین جوڑا پہن لو۔"

"نہیں مجھے سفید ہی کپڑے اچھے لگتے ہیں"، وہ لاپرواہی سے بولیں۔ "شام تک لوٹ آؤں گی۔ شاید ابا میاں کو کہیں جانا ہے اس لئے گاڑی نہیں لے جا رہی ہوں۔"

شام کے سات آٹھ بجے کے انداز میں ایک لڑکا ایک چھٹی لے کر آیا ـــ رضیہ کی تحریر تھی، اپنے باپ کے نام ـــــ

ابا میاں

آج شام پانچ بجے میں نے اپنی پسند سے بے ؔ سے شادی کر لی ہے ـــ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس خبر سے بہت دکھ پہنچے گا مگر ساتھ ہی یہ بھی یقین ہے کہ آپ میری اس خطا کو

اپنے دُکھ مجھے دے دو

شادی کی رات بالکل وہ نہ ہوا جو مدن نے سوچا تھا۔

جب چمکی بھابی نے پھسلا کر مدن کو بیچ والے کمرے میں دھکیل دیا تو اندر سامنے شالو میں لیٹی ہوئی، اندھیرے کا بھاگ بنی جا رہی تھی۔ باہر چمکی بھابی، دریا باد والی پھوپھی اور دوسری عورتوں کی ہنسی، رات کے خاموش پانیوں میں مصری کی طرح دھیرے دھیرے گھل رہی تھی۔ عورتیں سب یہی سمجھتی تھیں۔ اتنا بڑا ہو جانے پر بھی مدن کچھ نہیں جانتا۔ کیونکہ جب اسے بیچ رات کے نیند سے جگایا گیا تو وہ ہڑبڑا رہا تھا "کہاں، کہاں لیے جا رہی ہو مجھے؟"

ان عورتوں کے اپنے اپنے دن بیت چکے تھے۔ پہلی رات کے بارے میں ان کے شریر شوہروں نے جو کچھ کہا اور مانا تھا اس کی گونج تک ان کے کانوں میں باقی نہ رہی تھی۔ وہ خود رس بس چکی تھی اور اب اپنی ایک اور بہن کو بسانے پر تلی ہوئی تھیں۔ زمین کی یہ بیٹیاں مرد کو تو یوں سمجھتی تھیں جیسے بادل کا ٹکڑا ہے جس کی طرف بارش کے لئے منہ اٹھا کر دیکھنا ہی پڑتا ہے، نہ برسے تو منتیں ماننی پڑتی ہیں، چڑھاوے چڑھانے پڑتے ہیں، جادو ٹونے کرنے ہوتے ہیں۔ حالانکہ مدن کا لکاجی کی اس نئی آبادی میں گھر کے سامنے کھلی جگہ میں اسی وقت کا منتظر تھا، پھر شامت اعمال پڑوسی سبطے کی بھینس اس کی کھاٹ ہی کے پاس بندھی تھی جو بار بار پھنکارتی ہوئی مدن کو سونگھ لیتی تھی اور وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر اسے دور رکھنے کی کوشش کرتا۔ ایسے میں بھلا نیند کا سوال ہی کہاں تھا؟

سمندر کی لہروں اور عورت کے خون کو راستہ بتانے والا چاند، ایک کھڑکی کے راستے سے اندر چلا آیا تھا اور دیکھ رہا تھا دروازے کے اس طرف کھڑا مدن اگلا قدم کہاں رکھتا ہے۔ مدن کے اپنے اندر ایک گھن گرج سی ہو رہی تھی اور اسے اپنا آپ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے بجلی کا کھمبا ہے جسے کان لگانے سے اسے اندر کی سنسناہٹ سنائی دے جائے گی۔ کچھ دیر یونہی کھڑے رہنے کے بعد اس نے

معاف کردیں گے ـــــ آخر میں آپ کی اکلوتی بچی ہوں اور بچپن سے آپ میری خطائیں معاف کرتے آئے ہیں۔

آپکی دعاؤں کی طالب
رضیہ

✣ ✣ ✣

آٹھ دن سے رضیہ گھر سے باہر تھی۔ اور اشرف میاں کا یہ عالم تھا کہ مارے غصے کے انگاروں کی طرح پھنکے جا رہے تھے۔ گھر کی فضا ہی بدل گئی تھی، نہ کوئی کسی سے بات کرتا تھا نہ کسی کے مزاج ملتے تھے۔ بس اپنی اپنی جگہ جلے جا رہے تھے۔ ایک دن بڑی ہمت کر کے بڑی بیگم نے اشرف میاں سے کہا۔

"اَب میں کہوں غصہ رہنے کرکے فائدہ بھی کیا ہے جو ہونا تھا سو ہو گیا ــــ اَب ہمارے غصہ سے شادی تو ٹوٹنے سے رہی۔"

"شادی نہیں ٹوٹ سکتی، ٹھیک ہے۔ مگر میں اس کم بخت کو بندوق سے پھونک تو سکتا ہوں ــــ اس کی اتنی ہمت ہوئی تو کیسے؟" مارے غصے کے ان کے منہ سے بات نہ نکل رہی تھی۔

"مار کے بھی فائدہ کیا ملے گا؟ اچھا ہی ہوا اپنے گھر کی ہو گئی۔ تنہائی بڑی بری ہوتی ہے۔"
اشرف میاں نے تیوریوں کر کے ان کی طرف دیکھا

"کوئی حماقت سی حماقت ہے، خود بھی کہے جا رہی ہیں اچھا ہوا ــــ کیا اچھا ہوا؟ کاہے کی تنہائی تھی یہاں؟"

"مرد کے سہارے کی ضرورت تو ہر عورت کو محسوس ہوتی ہے، کیا یہ اچھا نہ ہوا کہ اس نے اپنی پسند اور چاہت سے یہ سہارا ڈھونڈا ہے؟ عورت اگر تنہائی محسوس نہ کرے تو دنیا میں مرد کی ضرورت ہی نہ پڑے۔" وہ خالی خالی نگاہوں سے اشرف میاں کو دیکھ رہی تھیں۔

اشرف میاں نے ایک لمحے کو انکی طرف اور دیکھا۔ لمحہ بھر خاموشی رہی ــــ ایکدم وہ بھپر کر بولے۔ "بال سفید ہو رہے ہیں مگر عقل نام کو نہیں۔"

"اتنے غصے رہنے سے بھی کام نہ چلے گا۔ پیٹ کی اولاد ہے آخر ــــ معاف کیوں نہیں کر دیتے۔"

"معاف کرسکتا ہوں مگر اس صورت میں کہ وہ پھر کبھی اپنی سسرال نہ جائے۔"

"اے لو۔ کیا بیٹیاں اسی لئے سہاگ کی چاہت کرتی ہیں کہ گھر بیٹھ جایا کریں؟"

"تو پھر میں اس کم بخت کو کبھی معاف نہیں کرسکتا۔ زندگی بھر اس کی صورت دیکھنا مجھ پر حرام ہے۔"

"ہے ہے ایسی بڑی بڑی قسمیں نہ کھایئے ــــ کیسے باپ ہیں سمجھ میں نہیں آتا ــــ قصور تو اولاد سے ہوتا ہی ہے۔ کیا یونہی قسمیں کھا لیا کرتے ہیں؟"

"ایسا قصور تو کوئی بھی نہیں کرتا نا مگر" ــــ وہ ذرا نرم پڑ کر بولے۔ "نامراد نے عزت مٹی میں ملا دی، ان آٹھ دنوں میں آدھا بھی نہیں رہ گیا ہوں۔"

"لو بھلا ــــ عزت کاہے سے مٹی میں ملا دی۔ کیا کوئی حرام کا پیٹ گرایا ہے یا کوئی ناجائز بچہ جنا ہے۔ بس پسند سے شادی ہی کی ہے نا ــــ اس میں کیا گناہ ہوگیا ــــ یہ تو زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔"

اشرف میاں نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔ پھر بولے۔ "مگر میں تو اپنی جگہ اب تک یہی سمجھتا رہا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہوگئی ہوگی اسی کو چھپانے کے لئے شادی رچالی۔"

"جانے کس کس کے بہکاوے میں آجاتے ہیں آپ، گھر میں چلتی پھرتی دیکھ کر کبھی تو مجھ پر بھید کھلتا؟ بالکل بے قصور ہے بچاری ــــ بس اتنا ہی قصور کہ اپنی پسند سے بر چنا ہے۔ اچھا ہی کیا ــــ زندگی تو اسی کو گزارنی تھی۔ اگر ادھر اُدھر بیاہ کر باندھ دیتے تو کیا ہوتا۔ جیتے جی مرجاتی، اب تو میں کہتی ہوں سیدھی طرح معاف کر دیجئے، اور چار لوگوں کے سامنے رخصتی کر دیجئے۔ شادی تو ہو ہی گئی۔"

اشرف میاں پھر بدک گئے ــــ "ہاں ہاں رخصتی کر دوں! کیوں کر دوں؟ مجھے معلوم ہے اسی کم بخت نے میری بچی سے اسی لئے شادی کی ہے کہ جہیز اور زیور اس کے ہاتھ لگے۔ محبت وحبت خاک نہیں ــــ آجکل کے لونڈوں کو کسی سے محبت نہیں ہوتی بس ....."

"ہے ہے کیسی ناسمجھی کی باتیں کرتے ہیں آپ اس بے چارے کو لاپچ ہوتی تو یوں کھڑا کھڑی شادی کاہے کو رچاتا کہ صرف جسم کے جوڑے سے گئی تھی رضو۔ نہ کوئی بھاری جوڑا نہ جسم پہ ماشے کا چھلا ــــ خواہ مخواہ کی بدگمانی بھی ٹھیک نہیں۔" بڑی بیگم کی آنکھوں

میں بے بات بھی گھل رہی تھی۔

اسی دن شام میں رضیہ آئی۔ اشرف میاں الماری سے کتاب نکالنے کھڑے تھے۔ یہ جا کر ان سے لپٹ گئی۔ پیٹھ موڑ کر دیکھا تو رضیہ تھی — کہاں تو بندوق سے پھونک دینے کا عزم کئے بیٹھے تھے۔ یا اب گلے سے لپٹا لیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ شرماتے جھینپتے بنّے میاں بھی آئے جو توتی کی طرح کھڑے تھے۔ سسر نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"آؤ بیٹھو نا میاں — اب تو تم ہمارے داماد ہوئے"

❊

شادی کا اصل ہنگامہ اب نکاح خوانی کے پندرہ بیس دن بعد ٹھہرا۔ اشرف میاں بڑی حیثیت کے مالک تھے اور روپے پیسے کی بھی کمی نہ تھی — بیٹی کا جہیز کچھ تو پہلے ہی سے تیار تھا کچھ اب ہو گیا۔ سب اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے بڑی بیگم جہیز کے کمرے میں ایک ایک چیز لا کر رکھتی جاتیں۔

"دیکھئے یہ ساڑیاں آپ دلی سے لائے تھے۔"

"یہ پاندان مراد آباد کا ہے۔"

"یہ جوڑیاں آگرے کی ہیں۔"

ان کی سفید ساڑی کا پلو بار بار گرتا اور وہ بار بار سنبھالتیں۔

"ارے — یہ پاندان کیوں رکھ دیا وہاں — رضیہ بھلا پان کب کھاتی ہے؟"

"اے واہ تو کیا ہوا۔ آخر دولہے کو بنا کر دے گی تو سہی۔" ان کے چہرے پر شعلہ سا جلا اور اسی لمحے بجھ بھی گیا — وہ پھر سامان کی اٹھا پٹخ میں جٹ گئیں۔

ایک زعفرانی ساڑی انہوں نے میز پر پھیلائی۔ "یہ آپ لکھنؤ سے لائے تھے نا دھیان سے مجھے بتاتے جائیے۔ جانے بیچاری ذکیہ کے ہاتھ کی چیزیں کہاں کہاں رکھی ہیں۔"

"زعفرانی رنگ تو سانولی رنگت پر خوب کھلتا ہے۔ رضیہ تو اچھی خاصی گوری ہے۔ جانے کیوں خریدی تھی۔"

سامنے کے سنگھار دان میں بڑی بیگم کو اپنی سانولی رنگت تیزی سے سرخی میں ہلتی دکھائی دی۔

وہ جھٹ سامنے سے ہٹ گئیں۔

ڈھم ڈھم دھم ڈھول پٹے۔ اور فضو بی چار لوگوں کی موجودگی میں بنے میاں کی ہوگئیں۔ رخصتی ہوگئی رضیہ بی اپنی ساس، نندوں اور دولہا کے ساتھ سسرال چلی گئیں۔ سنسان گھر میں کچھ لوگوں کی چہک اور جھائیاں باقی رہ گئیں۔ گلی میں ابتک زور زور سے باجے بج رہے تھے۔

اشرف میاں بوجھل قدموں سے گھر میں داخل ہوئے بیٹی بیٹھی رہی تو دل ڈوبا جائے تو چھاتی بوجھل۔ بڑی بیگم بار بار اپنی آنکھیں پونچھتیں اور آنسو پھر اسی تیزی سے پڑ آتے۔

"گھر کیا سنسان ہوگیا ہے۔" وہ بھرے گلے سے بولیں۔

"ہاں اب سنسان ہی سنسانی ہے۔ رضیہ اپنے گھر کی ہوئی بیٹی باہر کے۔ تم تھیں سو ایک رضیہ کی وجہ سے لیکن اب ہم ہی ہم ہیں۔" بڑی بیگم نے انکی طرف دیکھا۔ وہ اپنی عمر سے کہیں بوڑھے نظر آرہے تھے۔

"ہاں رضیہ کی وجہ سے بڑی دبنگی تھی۔ مگر بیٹیاں بھلا کب تک ساتھ دیا کرتی ہیں۔"

"بیٹیوں کا کیا ہے۔ کوئی بھی تو نہیں دیتا۔ چار دن رہ کر سب اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے جاتے ہیں۔" انہوں نے جلدی جلدی پلکیں جھپکا کر بڑی بیگم کو دیکھا اور اک دم کچھ یاد کرکے بولے۔ "ہاں جی تم تو خود رضیہ اور بنے کی شادی کے انتہائی خلاف تھیں۔ پھر تم ہی نے کیسے ان کا ساتھ دیا؟"

"میں نے؟" وہ حیرت سے بولیں۔

"اور کیا میں نے؟ کبھی کہتیں رضیہ کو معاف کردو کبھی کہتیں رخصتی کردو۔ کبھی پیچھا اٹھاتیں کہ وہ بنے کو گھر بلالو، کبھی کہتیں بنے اچھا خاصا لڑکا اور کبھی - - - - - - -"

بے تکے انداز میں بڑی بیگم بولیں "میں نے سوچا ہو سکتا ہے تنہائی کا بھوت جس طرح مجھے ڈستا رہتا ہے اسی طرح رضیہ کو بھی ڈستا ہو۔ پھر یہ مجھے اپنی زیادتی ہی لگی۔"

"زیادتی؟" اشرف میاں حیرت سے بولے۔ "وہ کیسی؟"

"رضیہ کو کسی نہ کسی کا سہارا تو ہونا ہی تھا۔ سو اس نے ڈھونڈھ لیا۔ رضیہ کی کیا بات ہے کوئی بھی عورت بغیر سہارے کے نہیں رہ سکتی۔ پھر اس میں ناراضگی اور غصے کی کیا بات۔ اور پھر بیچارہ بنے اچھا خاصہ سمجھدار لڑکا ہے۔"

"تم نے اس کے دل میں جھانکا ہے جو یوں کہتی ہو، کیا پتہ وہ تیز مزاج ہی ہو۔ بھلا رضیہ کو کہاں سہارا

ہو گی کہ مرد کی گھُرکیاں سُنے۔"

سوئے سوئے لہجے میں وہ بولنے لگیں ۔۔۔ "ہونہہ سہار کہاں ہو گی ۔۔۔ مرد کی گھُرکی کھانے میں کیا برائی ہے بھلا؟ اور پھر عورت جس سے پیار کرے اس کی گھُرکیاں سننے میں بھی مزہ آتا ہے۔"

وہ آپی آپ چونکیں۔ "کیا کہا میں نے!"

"تم کہو یہ وہی کہتیں کہ تمھیں مجھ سے پیار ہے اور تمھیں میری گھُرکیاں کھانے میں مزہ آتا ہے۔"

وہ گھبرا گئیں۔ "واقعی میں نے یہ کہا؟"

اشرف میاں نے انکی طرف غور سے دیکھا۔ بڑھاپا زبانِ حال سے کہہ رہا تھا میں آرہا ہوں۔ میں آرہا ہوں۔ میں۔۔

اِک دم اشرف میاں زور سے بولے۔

"ارے تم نے وہ زعفرانی ساڑی رضیہ کے ساتھ کر دی کیا؟"

"اور کیا رکھ لیتی ۔۔۔ بیٹی کی جہیز میں رکھ دی"۔ وہ دھیرے سے بولیں "لاحول ولا قوۃ" وہ تیز ہو کر بولے "اب بھلا رضیہ پر کیا کھلے گی وہ ساڑی ۔۔۔ اِک دم گوری ہے رضیہ۔ تم پہنتیں تو کس قدر اچھی لگتیں۔"

اِک دم بڑی بیگم کی نگاہ جہیز پر پڑے ہوئے پاندان سے جا ٹکرائی۔

"اے ہے۔ پاندان نہیں رہ گیا!"

"رہ نہیں گیا۔ میں نے رکھ لیا۔"

"کیوں؟" بڑی بیگم تعجب سے بولیں "تمہارے لئے" وہ ذرا سا مسکرائے۔

"دوئی میں کب پان کھاتی ہوں بھلا۔"

"نہیں کھاتیں تو مجھے تو بنا کر دو گی۔"

بڑی بیگم نے گھبرا کر منہ اوپر اٹھایا ۔۔۔ اشرف میاں انکے چہرے پر جھکے چلے آرہے تھے۔ سارے میں پھولوں اور صندل کی مہک مہکار رہی تھی۔ ڈھم ڈھم ڈھم ڈھم ۔۔۔ باجوں کی تیز آواز ان کے کانوں میں گھس کر پردے پھاڑنے لگی۔

ایمان کی سلامتی

"حافظ جی آئے ہیں"۔ اماں بی کا ہلتا ہوا سر تھام کے تقریباً ان کے کان میں گھستے ہوئے فریدہ نے سنایا۔

حافظ جی کے آنے کی خبر سن کر اماں بی کا روئی کی طرح سفید سر اور ڈگمگانے لگا۔ اپنی افیون کی ڈبیہ انہوں نے تکیے کے نیچے چھپا دی۔ حمائل شریف چوکی پر رکھی۔ اور سفید پلکوں پر سے بہتا ہوا پانی پونچھ کر وہ پلنگ پر اپنی چادر ٹٹولنے لگیں۔

اُن کا پوتا سلیم اماں بی کے ان بڈھے چونچلوں کو سخت ناپسند کرتا تھا کہ پچھتر برس کی عمر میں بھی بعض گنتی پردہ ہو رہا ہے، حافظ جی کے آنے کی خبر سن کر چادر ٹٹولی جا رہی ہے۔ کہیں جانا ہو تو تانگے میں پردے لگائے جا رہے ہیں۔ عورت چاہے اماں بی کی طرح سوکھ کر کانٹا بن جائے مگر نحوست ہی پھر بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اب بھلا بتائیے حافظ جی بچارے خود آنکھوں سے اندھے کانوں سے بہرے مگر اماں بی ان کا آنا سن کر یوں اچھل پڑیں جیسے ان کا منگیتر پسند کرنے آرہا ہو۔ سلیم کے بدبداتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھ کر اماں بی سمجھ گئیں کہ انہیں نصیحت کی جا رہی ہوگی!

"عورت پہ تو قبر کے تین دن بھی بھاری ہوتے ہیں۔ زندگی بھر غیر مرد نے ایک بال نہ دیکھا تو اب تمہاری بہنوں کی طرح سر جھاڑ منہ پہاڑ، چھاتی کھولے کیسے مٹکتی پھروں۔"

ویسے بھی حافظ جی تو اُن کے دشمنوں میں سے تھے۔ اماں بی کے خاندان اور کھارے کنوئیں والوں سے تو ایک زمانے کی عداوت چلی آرہی تھی۔ اُس زمانے سے، جب حافظ جی کے سکڑ دادا نے اماں بی کے سکڑ دادا کی زمینوں پر چری بوائی تھی۔ بڑھتے بڑھتے اس بات میں اتنی شاخیں پھوٹیں کہ اماں بی کے دادا نے حافظ جی کے کسی بزرگ سے بیچ چوک میں کھڑے ہو کر کہا تھا۔ آج سے ہمارے اور کھارے کنوئیں والوں کے درمیان سارے رشتہ ناطے بند۔ حرامی ہوگی وہ اولاد جو تمہارے دروازے پہ جائے"۔

یہ بات اس زمانے کے بزرگوں کے منہ سے نکلی تھی جب بزرگ یونانی دیوتاؤں کی طرح کائنات کی ساری چابیاں اپنے ہاتھوں میں رکھتے تھے۔ لہٰذا سب نے حدیث شریف کی طرح اس بات کو ہمیشہ سامنے رکھا۔ مرتے مر گئے مگر نہ اپنی بیٹی لی نہ اپنی دی۔ ویسے آمنے سامنے دروازے ہوں تو خوشی غمی میں شریک ہونا ہی پڑتا۔ پڑوسیوں سے لڑنے اور ملنے کی روائتیں بھی نبھائی جاتیں۔ بچے ہیں تو ایک آنگن میں چھپک چھپا کھیل رہے ہیں۔ جوان ہیں تو ایک دوسرے کی

دوستی کو نبھا دکھانے کی فکر میں ہیں۔ بزرگ بھی اوپری جی سے ملتے مگر اس طرح کہ بھری محفل میں ایک دوسرے کی دکھتی رگ پکڑنے سے کبھی نہ چوکے۔

حافظ جی اسّی کے پھیر میں تھے۔ وہ تو کہو کہ اگلے وقتوں کی کھلائی پلائی تھی کہ اس عمر میں بھی لاٹھی پکڑ کے گلی پار کر لیتے تھے۔ بجھتے دیے جیسی آنکھوں پہ موٹی کمانیوں کی عینک لگا کے لوگوں کو پہچاننے کی کوشش کرتے۔ ہاتھ پیروں میں رعشہ، زمین اپنی طرف بلا رہی تھی اور وہ جھکتے جا رہے تھے۔ اوپر سے دمہ تھا کہ ایک پل چین نہ لینے دیتا تھا۔ ہر وقت دھونکنی چلتی رہتی تھی۔ یوں سمجھیے کہ فرشتوں کو چل دے کر جیے جا رہے تھے۔

مگر آج اماں بی نے انھیں جس بات کیلئے بلایا تھا، اس نے انکا ٹھنڈا خون کھولا دیا تھا۔ اتنا جوش تھا کہ کہاں تو پٹی سے اترنا دوبھر تھا یا ایک جانب کسی بچے کا سہارا لئے ایک جانب لاٹھی ٹیکتے اماں جی سے ملنے نکل کھڑے ہوئے۔ کھٹ کھٹ کرتے وہ اندر آئے تو اماں جی کی چھوٹی بہو آگے بڑھیں کہ ہاتھ پکڑ کر راستہ دکھائیں۔ مگر انہوں نے ہاتھ جھٹک دیا۔ یہ گھر میرے لئے نیا تھوڑی ہے بیٹا۔ میں نے تو اس آنگن میں گلی ڈنڈا کھیلا ہے۔

حافظ جی کی اس بات پر سارا گھر ہنس پڑا۔ کیا یہ بھی کبھی بچہ تھے ــــ! یقین نہ آتا تھا۔

اچھی ہو ــــ؟ وہ خود کانوں سے بہرے تھے۔ اسلئے اتنے زور سے بولتے تھے کہ دوسرا بہرا بھی سن لے۔ چنانچہ بہری اماں بی نے انکی بات کا جواب دینے کیلئے جلدی جلدی اپنا پوپلا منہ چلایا۔ ”اچھے ہیں تو کون سا تیر مار لیا ہے۔ ہمارا تو جینا مرنا سب برابر ہے۔ جانے کونسی گھڑی مقرر ہے کہ آ ہی نہ چکتی“۔ انہوں نے ڈگر ڈگر ہلتی ہوئی گردن کو تکیے کے سہارے ٹھہرایا اور یاد کرنے لگیں کہ پہلے اپنی دائمی کھانسی کا حال سنائیں یا اختلاج کا، پیروں پر ورم کی تکلیف بیان کریں یا گٹھیا کا دکھ سنائیں۔

ہاں ــــ حافظ جی کو لوگوں نے اٹھا کر پلنگ پر ڈھیر کر دیا تو وہ ایک بلّے کر کے لمبی لمبی سانس لینے لگے۔ ”ٹھیک کہتی ہو، ہم تم بھی اب کنارے آ لگے۔ اب تو یہی دعا ہے کہ اللہ ساتھ ایمان کے اٹھائے۔ ایمان مضبوط ہے تو پل صراط بھی پار کر لیں گے“۔ اتنے میں ایک نوکر نے حقّہ بھر کر سامنے رکھا اور نے حافظ جی کے ہاتھوں میں تھما دی۔

مگر اماں بی نے ان کی پوری بات نہ سنی۔ کچھ دنیا سے اٹھانے کی بھنک کان میں پڑی۔

”اور کیا۔ میں تو یہ سوچتی ہوں کہ اس قیامتی وقت کو دیکھ کر دل بند کیوں نہ ہو جاتا ہمارا ــــ؟“ وہ چپکے چپکے افیون کی ڈبیہ ٹٹولنے لگیں کیونکہ جمائیوں کے مارے برا حال تھا۔

"اوس کی مصلحت ہے۔ حافظ جی نے انگلی اُٹھا کر اوپر دکھایا اور حقہ کا گھونٹ بھر کے دھواں چھوڑتے ہوئے بولے۔

"نمرود کی خدائی میں تو اس نے آگ لگا دی تھی۔ مگر یہ مردود تو آسمان پر تکلی لگا رہے ہیں۔ دیکھتی جاؤ کیسا قہر نازل ہوگا۔" بات ختم کر کے وہ یوں چپ ہو رہے جیسے اس قہر کے ٹوٹنے کا انتظار کر رہے ہوں۔

"اے تو کیا یہ قہر سے کچھ کم ہے۔" اماں بی نے ہاتھ نچا کے انگلی لبوں پر رکھی۔

"لڑکیاں اپنے منہ سے بَر مانگ رہی ہیں۔"

حافظ جی چونک پڑے۔ حقہ کی نَے ہاتھ سے چھوٹ گری۔ جیسے اس قہر کا پہلا پتھر اُن پر آن گرا ہو۔ یہ تو اماں بی صفاً ان پر چوٹ کر گئی تھیں۔ ابھی وہ ایک ہی چوٹ سے سنبھل رہے تھے کہ اماں بی نے پھر اور شروع کر دیا۔ "اب کہاں گئیں وہ اونچی ناکیں جو اپنی ضد میں آکے آڑے آڑے پل چیر دیا کرتی تھیں۔ ایسے جوان ہنستے گاتے اُٹھ جاتے ہیں۔ مگر اللہ میاں نے ہمیں تو جنیں کیا کیا دکھانے کو باقی رکھا ہے۔" لیکن حافظ جی کو کھانسی کے پھندوں نے کچھ نہ کہنے دیا۔ صرف بے بسی سے ہاتھ ہلاتے رہ گئے۔

اماں بی سچ مچ جینے سے بیزار ہو چکی تھیں۔ زندگی کے سارے رنگ تو دیکھ ڈالے۔ میاں کی چکو مت کی اور ساس کی مار بھی کھائی۔ ایک جوان بیٹے کو اپنے ہاتھ سے کفن پہنایا۔ دو لڑکوں کے سر پر سہرے باندھے۔ پھر ان کے بچوں کو بھی اپنے ہاتھ سے دولہا بنایا۔ اور تین دامادوں کی آؤ بھگت کی۔ بیس برس ہوئے کہ سہاگ کی چوڑیوں پر پتھر گرا۔ زندگی کی یہ کڑواہٹ بھی گھونٹ گھونٹ کر کے پینا پڑی۔ اب وہ سارے محلے کی اماں بی کہلاتیں۔ آیا گیا ان کے نورانی چہرے کو دیکھ کر ٹھٹھک جاتا۔ انھیں سلام کر کے ان کی دعاؤں کا منتظر رہتا۔ لوگ کہتے تھے اماں بی اگر کسی کو دل سے دعائیں دیں تو وہ ضرور پوری ہوتی تھیں۔ سفید چاندی کے بالوں میں چھپی ہوئی چہرے کی میلی جھریاں اماں بی کے صبر و استقلال کی کہانیاں کہتی تھیں۔ ان کے چہرے پر ڈوبتے سورج کی خوبصورتی تھی۔

اب تو وہ دن آن لگے تھے کہ وہ سارے گھر کیلئے گرم دودھ بن گئی تھیں جو نہ نگلا جاتا تھا نہ اگلے بنتی۔ ان کی بک بک جھک جھک سے سب بیزار تھے۔ مگر کوئی مانے یا نہ مانے وہ ہر بات کو اپنے زمانے سے ملا کے دیکھتی تھیں اور لعنت بھیجا کرتیں۔ نواسے پوتوں کے خون میں تو خیر پھر ملاوٹ تھی۔ مگر ان کے اپنے بیٹے بیٹیاں بھی اماں بی کے کہے کو مجذوب کی بڑ سمجھتے تھے۔ شاید اللہ میاں کے ہاں ان کی عمر کے

حساب کتاب کے کاغذ چھپے لگے تھے اور وہ بس جیت جا رہی تھیں۔ اب ایسی بات کو لے لو۔ سات پشتوں سے ہوتی چلی آرہی تھی کہ کھاریے کنویں والوں سے رشتے ناطے نہیں ہوتے۔" مگر آج اماں بی کے ناخلف پوتے سلیم نے طے کر لیا تھا کہ بیاہ کرے گا تو حافظ جی کی نواسی غزالہ سے، اور دونوں کے ماں باپ رشتہ کرنے کو ہنسی خوشی راضی تھے۔ اماں بی نے سُنا تو سر پیٹنے لگیں، چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اُٹھا لیا۔ اپنے بیٹے کے بازو میں لٹک گئیں کہ پہلے انہیں قبر میں ڈال آئے۔ پھر کھاریے کنویں والوں کی بیٹی اس چوکھٹ پر چڑھے گی۔ اماں بی کا بیٹا ابھی حال ہی میں پروفیسری سے ریٹائر ہو کر گھر میں آن پڑا تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد خاندان کو سنوارنے اور پرانی روایتوں کو نبھانے کا شوق اکثر جاگتا ہے مگر چلتی ہوا کے آگے بند نہیں باندھے جا سکتے۔ یہ بات پچھتر برس کی اماں بی نہ سمجھ سکیں لیکن ایک ریٹائر پروفیسر تو سمجھتا ہے!

مایوس ہو کر اماں بی نے حافظ جی کو بلا بھیجا۔ وہ سارے محلے کی اماں بی تھیں تو حافظ جی بھی اپنے خاندان میں تبرک کے طور پر رکھے جانے والے بزرگ تھے۔ بیٹوں بیٹیوں، پوتوں، پڑپوتوں کو ملا کے بیٹھتے تو تعداد سو تک پہنچ جاتی تھی۔ وہ لوگ خود ان پردیسی سوداگروں کو اپنے سے نیچا سمجھتے تھے۔ دنیا جانتی تھی کہ اماں بی کے سکڑ دادا کے کوئی لکڑ دادا اونٹوں پر نمک لادے کہیں سے آئے تھے۔ اب وہ اپنے منہ سے سید کہیں تو دنیا کو ماننا ہی پڑتا۔ ویسے دل کا حال کون جانے کہ کس کھیت کی مولی تھے —! حافظ جی کا بس چلتا تو وہ بھی چٹخنی پٹخنی غزالہ کو زندہ گاڑ دیتے۔ مگر غزالہ پر تو اُن کے داماد کا بھی بس نہ چلتا تھا۔

"وہ کوئی ناسمجھ بچی تھوڑی ہی ہے۔ ڈاکٹری پاس کر چکی ہے۔ اپنا بُرا بھلا سوچ سکتی ہے۔"

حافظ جی نے داماد کی یہ بات سنی تو چکرا کے رہ گئے۔ کیا لڑکیوں کے پاس بھی دماغ ہوتا ہے! وہ بھی اپنے بُرے بھلے پر غور کرتی ہیں! انھوں نے لاٹھی سنبھالی اور چلے اماں بی کے پاس۔

جب سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہوں تو اترانا کیسا! مگر اماں بی تو کانٹوں بھری جھاڑی کی طرح اُلجھیں لپٹ گئیں۔ ایک تو کھانسی کے پھندے۔ اوپر سے اماں بی کے زہر میں بجھے ہوئے جملوں کے لیے موزوں الفاظ کی تلاش۔ حافظ جی تیز ہوا میں کانپنے والے کیڑے کی طرح لرزنے لگے۔

"میں جانتا ہوں تمہاری سب چالیں۔ وہی زمینوں کا انتقام لے رہی ہو —! مگر یاد رکھو۔ خود بھی قبر میں پیر لٹکائے —" لیکن اماں بی نے ہاتھ اُٹھا کر اُنکی بات بیچ میں کاٹ دی۔

"ارے جاؤ بڑے آئے قبر کے عذاب سے ڈرانے والے۔ پہلے اپنی اُن گھٹنیوں کو تو دو کہ جو معصوم

بچوں کا راستہ گھیرتی پھرتی ہیں۔ اُن کے لئے بھی تو اللہ نے کوئی سزا مقرر کی ہے جنھوں نے تمہاری سفید داڑھی میں کالک مَلی ہے۔"

"م ـــ م ـــ میرے ـــ میری نواسی کو کچھ کہا تو ـــ تو ـــ" حافظ جی ہاتھ کے اشارے سے بات پوری کرنے لگے۔ وکالت کر چکے تھے۔ مگر یوں اماں بی کی طرح چکھ پھیریاں دینے والے مخالف وکیلوں سے پالا تھوڑی پڑا تھا۔

"ائے ہے ـــ بڑے آئے اونچی ناک والے۔" غصہ کے مارے اماں بی کی سانس پھولنے لگی۔

"سب جانتے ہیں تمہاری پھوپھی کے کرتوت۔ کون جانے کیا عیب تھا کہ ٹھیکرے کی مانگ ٹوٹی تھی۔"

"اور تمہارے ـــ تمہارے ـــ" حافظ جی غصہ کے مارے تن پھنا گئے۔ ہاتھ اٹھا کے کچھ کہنے کی کوشش کر رہے تھے کہ حقہ کی چلم گر کے ٹوٹ گئی۔

"بس بس رہنے دو۔ میرے عیب کیا گنو گے تم۔ میں نے اپنی ناک اونچی رکھنے کیلئے اپنے آپکو خاک میں ملا دیا ہے۔"

عورت سے بحث میں کون مرد جیتا ہے کہ حافظ جی جیت جاتے۔ انکی رگوں میں جما ہوا خون شائیں شائیں کرنے لگا۔ جی چاہ رہا تھا اس بد زبان پوپلی بڑھیا کو اٹھا کے تنکے کی طرح پٹک دیں۔ یوں بھی عورت کی زبان کے سامنے مرد ایک ہی ہتھیار استعمال کرتا ہے ـــ قوت ـــ مگر آج تو وہ ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے مفلوج تھے۔ ایک قدم چلنا پڑتا تو سہارے کیلئے کسی کو پکارتے۔ زبان کی پٹڑیاں جگہ جگہ سے اکھڑ چکی تھیں۔ آنکھوں میں سیاہ تارے ٹوٹتے رہتے تھے۔ مرد کو اس سے زیادہ عبرتناک سزا اور کیا مل سکتی ہے ـــ! شور سنکر سب گھر والے اپنے اپنے کام چھوڑ کے آ گئے۔ اور کہہ سنکر دونوں کو ٹھنڈا کیا۔

"اب آپ لوگوں کے یہ دن ہیں کہ بچوں کی طرح آپس میں لڑیں۔"

"اور کیا حافظ جی تو ہمارے دادا کے برابر ہیں۔" اماں بی کی بڑی پوتی زرینہ بولی۔

"ائے لعنت بھیجو ہم پر۔ تمہارا بس چلے تو ہمیں زندہ گاڑ دو ـــ" اماں بی نے مارے غصہ کے اپنا پلنگ گھسوٹ ڈالا۔ "یہ آجکل کے لونڈے ـــ ہونہہ ـــ آخر ہم بھی تو تھے" ـــ حافظ جی نے ہکلاتے ہوئے کہا اور خلا میں گھورنے لگے۔

"اور کیا ـــ ہمارے وقتوں میں تو ـــ اماں بی نے آنکھیں چندھیا کے حافظ جی کو گھورا اور دھکا سا کھا کے پیچھے کو لڑھک گئیں۔ ایک آنسو دکھوں کے تپتے ہوئے بیابان میں آن گرا۔ اور ایک لمحہ نے اچانک پیچھے پھیلی ہوئی زندگی پر یلغار کی۔ انھوں نے ہاتھوں کا چھجہ سا بنا کے آنگن میں

آگے بڑھ کر پلنگ کو کھینچ کر چاندنی میں کر دیا تاکہ دلہن کا چہرہ تو دیکھ سکے۔ پھر وہ ٹھٹک گیا۔ جبھی اس نے سوچا۔ اندو میری بیوی ہے، کوئی پرائی عورت تو نہیں جسے نہ چھونے کا سبق بچپن ہی سے پڑھتا آیا ہوں۔ شالو میں لپٹی ہوئی دلہن کو دیکھتے ہوئے اس نے فرض کر لیا، وہاں اندو کا منہ ہوگا اور جب ہاتھ بڑھا کر اس نے پاس پڑی گٹھری کو چھوا تو وہیں اندو کا منہ تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مدن نے سوچا تھا وہ آسانی سے مجھے اپنا آپ نہ دیکھنے دے گی لیکن اندو نے ایسا کچھ نہ کیا جیسے پچھلے کئی سالوں سے وہ بھی اسی لمحے کی منتظر ہو، اور کسی خیالی ہوس کے سونگھتے رہنے سے اسے بھی نیند نہ آ رہی ہو۔ غائب نیند اور بند آنکھوں کا کرب، اندھیرے کے باوجود سامنے پھڑپھڑاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ٹھوڑی تک پہنچتے ہوئے عام طور پر چہرہ لمبوترا ہو جاتا ہے لیکن یہاں تو سبھی گول تھا۔ شاید اسی لئے چاندنی کی طرف گال اور ہونٹوں کے بیچ ایک سایہ دار کھوہ سی بنی ہوئی تھی جیسی دو سرسبز اور شاداب ٹیلوں کے بیچ ہوتی ہے۔ ماتھا کچھ تنگ تھا لیکن اس پر سے ایکا ایکی اٹھنے والے گھونگھریلے بال ۔۔۔

جبھی اندو نے اپنا چہرہ چھڑا لیا جیسے وہ دیکھنے کی اجازت تو دیتی ہو لیکن اتنی دیر کے لئے نہیں۔ آخر شرم کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے۔ مدن نے ذرا سخت ہاتھوں سے، یونہی ہوں ہاں کرتے ہوئے دلہن کا چہرہ پھر سے اوپر اٹھایا اور شرابی سی آواز میں کہا۔

"اندو!"

اندو کچھ ڈر سی گئی۔ زندگی میں پہلی بار کسی اجنبی نے اس کا نام اس انداز سے پکارا تھا اور وہ اجنبی کسی خدائی حق سے رات کے اندھیرے میں آہستہ آہستہ، اس اکیلی بے یار و مددگار عورت کا اپنا ہوتا جا رہا تھا۔ اندو نے پہلی بار ایک نظر اوپر دیکھتے ہوئے پھر آنکھیں بند کر لیں اور صرف اتنا سا کہا "جی!" اسے خود اپنی آواز کسی پاتال سے آتی ہوئی سنائی دی۔

دیر تک کچھ ایسا ہی ہوتا رہا اور پھر ہولے ہولے بات چل نکلی۔ اب جو چلی سو چلی وہ تھمنے ہی میں نہ آتی تھی۔ اندو کے پتا، اندو کی ماں، اندو کے بھائی، مدن کے بھائی بہن، باپ، انکی ریلوے میل سروس کی نوکری، ان کے مزاج، کپڑوں کی پسند، کھانے کی عادت، سبھی کچھ کا جائزہ لیا جانے لگا۔ بیچ بیچ میں مدن بات چیت کو توڑ کر کچھ اور ہی کرنا چاہتا تھا لیکن اندو طرح دے جاتی تھی۔ انتہائی مجبوری اور لاچاری میں مدن نے اپنی ماں کا ذکر چھیڑ دیا جو اسے سات سال کی عمر میں چھوڑ کر دق کے عارضے سے چل بسی تھی۔ "جتنی دیر زندہ رہی بیچاری" مدن نے کہا۔ "بابوجی کے ہاتھ میں دوائی کی شیشیاں رہیں۔ ہم

کھڑا ہوا آم کا پیڑ دیکھا جس کی بور سے لدی ہوئی شاخیں سارے آنگن کو گھیرے ہوئے تھیں ... جھپٹ یہی پیڑ تو تھا جسے ابا میاں کسی باغ سے اکھاڑ کے لائے تھے۔ اور سب بچے اس کا "پپیا" بنانے کو پڑے تھے۔ مگر وہ بہت ہی اعلیٰ قسم کے آم کا پودا تھا۔ اس لیے ابا میاں نے سب کا ہاتھ جھٹک کر اماں بی کو وہ پکڑا دیا تھا (جو اس وقت ننھی کہلاتی تھیں) وہ کھرپی سے آنگن میں گڑھا کھودنے بیٹھیں تو پاس ہی حافظ جی بھی آ بیٹھے جنھیں ننھی "رجو بھیا" پکارنے کی بجائے ریاض کہتی تھی۔ (انھوں نے حافظ جی پر ایک نظر ڈال کے اس کھلنڈرے ریاض کو یاد کیا جو ان کے ہاتھ پکڑ کے کنوئیں میں جھلایا کرتا تھا) مگر اس نے کبھی اماں سے ریاض کی شکایت نہ کی۔ حالانکہ ڈر کے مارے اس کا دم نکل جاتا تھا۔ نہ جانے اس وقت ننھی کی کیا عمر تھی۔ مگر اتنا تو یاد تھا کہ وہ بچوں کے ساتھ کھیتوں میں دوڑیں لگانے کی بجائے اب سنبھل سنبھل کر چلنے لگی تھی۔ پھوپھی جان دن بھر اسے اپنے پاس بٹھا کے سینا سکھانے کے بہانے اپنے بچوں کے کرتے سلوایا کرتی تھیں۔ اگر ذرا بھی ٹانکا ٹیڑھا ہوا اور پھوپھی جان نے اس کی پنڈلی میں سوئی گھونپی مگر اس پر بھی وہ ہنسے جاتی تھی۔

نہ جانے کیوں آپ ہی آپ ہنسی آئے چلی جاتی تھی۔ مگر اس روز وہ بار بار اپنی آنکھیں دھنک رنگے دوپٹے سے رگڑتی پھر رہی تھی۔ جب ریاض نے کھرپی چھین کر خود گڑھا کھودنا چاہا تو اس نے ہاتھ جھٹک دیا۔ اس بات پر ریاض کو بڑا تعجب ہوا تھا۔ اس نے بڑے دکھ سے ننھی کو دیکھا جس کی نتھ میں موتیوں کی طرح آنسو گوندھ گئے تھے۔ ریاض کی وہ عمر تھی جب آدمی اپنے دل کا غلام ہوتا ہے اور دماغ اسے نافرمانی کی کوئی سزا نہیں دے سکتا۔

کھارے کنوئیں والوں سے رشتہ نہیں ہو سکتا۔ یہ بات ننھی کو اچھی طرح معلوم تھی۔ مگر پھر بھی وہ ریاض سے ہر وقت کچی املیاں منگوائے تو اماں کب تک ڈھیل دیے جاتیں۔ آخر ریاض سے صاف صاف کہنا پڑا کہ لڑکی سیانی ہو رہی ہے۔ گھر میں کھنکار کے آیا کرو۔

ریاض نے سنا تو یوں لڑکھڑا کے پلنگ پر بیٹھ گیا جیسے ٹانگیں ٹوٹ گئی ہوں۔ اب اس میں کیا رکھا تھا جسے اٹھا کے یہاں سے لیجاتا ـــ! جب چار ہاتھ مل کر آم کا پودا لگا رہے تھے تو ریاض نے اسے اپنے آنسوؤں سے سیراب کرتے ہوئے کہا تھا ـــ "اگر تم چاہو تو ننھی میں زندگی بھر یہاں رہ سکتا ہوں"۔ اور پھر مٹی میں سنے ہوئے ہاتھ جھٹک کے اس نے جاتے وقت کہا تھا ـــ "سوچ لینا!"

"تو پھر مت جاؤ!" یہ بات اس نے ایسی دلدوز چیخ کیساتھ کہی جو یقیناً عرش کو ہلا گئی ہوگی مگر اس کے

لبوں کو نہ ہلا سکی ۔۔" پھر اس نے کچھ نہ سوچا ۔۔ کیا لڑکیاں بھی سوچا کرتی ہیں!

پھر ایک دن گلی باجوں سے گونج اٹھی اور سارے محلے والے ننھی کی برات دیکھنے نکل آئے، جو ریاض کے گھر میں ٹھہرائی گئی تھی۔ ریاض بھی گلی میں آ کے آتش بازی دیکھنے لگا۔ کسی نے ایک انار کو رکھ کر انگارہ دکھا دیا۔ انار پہلے ذرا سا مسکرایا اور پھر ہنس پڑا۔ اس کے قہقہوں کے ستارے چاروں طرف چمک رہے تھے۔ پھر وہ ٹوٹے ستاروں کی طرح اندھیرے کو گہرا کر کے ڈوب گئے۔ چاروں طرف سیاہیاں چھا گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر اس انار کو اٹھانا چاہا تو ہاتھ جل گیا۔ اور وہ بڑی دیر تک انگلی پکڑے سی سی کرتا پھرا۔

اس دن ننھی نے اتنا سوچا اتنا سوچا کہ اس کے سینے میں آنسوؤں کی لڑیاں گندھ گئیں۔ وداع کے وقت وہ اماں سے لپٹ کے خوب روئی تھی۔ "اماں کیا میں سچ مچ اپنا آم کا پیڑ چھوڑے جا رہی ہوں ۔۔؟"

جس دن سے ریاض نے لڑکیوں کی چوٹی پکڑ کے جھولا جھلانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ لڑکیوں کو دیکھتا ہوا اکتانے سہمنے لگا۔ لڑکیوں کی شکل دیکھ دیکھ کر اسے بے نام سا خوف ہوتا تھا جیسے بچوں کو انجانی چیزوں سے ہوتا ہے۔

اس نے فر فر قرآن شریف حفظ کر کے محلے بھر سے حافظ جی کا خطاب پایا۔ پھر جھوم جھوم کر گلستاں بوستاں پڑھ ڈالی۔ وہ بلا کا ذہین تھا۔ اسے پڑھانے والے مولانا طاہر علی تک کہنے لگے کہ ریاض بے حد ذہین ہے۔ وہ کوئی سبق کوئی بات نہیں بھول سکتا۔

"کیوں نہیں بھول سکتا ۔۔؟" وہ خوفزدہ ہو کر مولانا کی صورت تکنے لگا تھا۔ "چاہوں تو بہت سی باتیں بھلا دوں۔" وہ گویا خم ٹھونک کر میدان میں اتر آیا تھا مگر مولانا ٹال گئے ۔۔ "اچھا اچھا چلو آگے پڑھو۔"

پھر وہ منصف بن گیا اور دنیا بھر کی قسمتوں کے فیصلے منٹوں میں کر ڈالے۔ پھر ایک دن محلے والوں کو شہنائی کی چیخ نے گلی میں اکٹھا کر دیا۔ وہ سہرا سنبھالتا ہوا گھوڑے پر سوار ہوا۔ اور کسی نے پھر ایک آتش بازی کا انار چلا دیا۔ اچانک اسے اپنی انگلی میں سوزش محسوس ہوئی۔ پھر یہ آگ بھڑک کر اسکے لس لس کرتے کپڑوں میں لگ گئی اور اسکا دم گھٹنے لگا۔ اور وہ لڑکھڑا کے گھوڑے پر سے گر پڑا تھا۔ مگر اسکی ریشمی گڑیا سی دلہن نے اسکے جی پر ایسے ٹھنڈے پھاہے رکھے کہ اس پر غنودگی سی چھا گئی تھی۔ اس طرح اس نے بڑے امن و سکون سے زندگی گزاری۔ گرمیوں کی دوپہروں میں وہ اپنے بیٹے بیٹیوں کو کہانیاں سنانے بیٹھتا تھا تو ننھی کے ہاں سے آئے ہوئے آموں سے اسکے دانت میں ایسا درد اٹھتا کہ سارے ریشے پھیلنے لگتے ۔۔ اس پیڑ کے پھل کیسے کھٹے نکلے ۔۔!

اور ننھی جب برسوں میں میکے آتی تھی تو آم کے تنے سے لپٹ جاتی۔

"ہائے اماں جانیں کیا بات۔ اکثر خواب میں دیکھتی ہوں کہ جیسے میں ہوں اور کھڑی اس آم کو آگ لگا رہی ہوں ۔۔"

خواب کا نام سنتے ہی سب کچھ لب پر چھوڑ کر قبلہ رو ہو بیٹھے "اوئی اللہ نہ کرے"۔ اماں کبھی کہتیں "یاد ہے ساجدہ ننھی کنوارپنے میں اس پیڑ کو بچوں کی طرح چاہتی تھی"۔ "پھر دن بھر میرا جی ڈوبا ڈوبا رہتا ہے۔" وہ کہہ جاتی ۔ "کبھی بچوں پر غصہ اتارتی ہوں کبھی ان سے لڑتی ہوں۔ بچارے چپکے بیٹھے ٹکر ٹکر مجھے دیکھتے رہتے ہیں۔"

"پھر جب وہ بیوہ ہوئی تو ہمیشہ کیلئے اس گھر میں آن بسی تھی۔ تب ایکدم اسے اپنی بزرگی کا احساس ہوا تھا۔ اس نے اپنے بچوں کو سمجھایا کہ کھارے کنوئیں والوں سے ان کا کتنا پرانا بیر چلا آرہا ہے۔ اور اسی وجہ سے اس زندگی کی ہر مٹھاس میں کیسی کڑواہٹ پڑی ہے۔ ادھر ریاض حافظ جی سے وکیل بنا۔ وکیل سے منصف بنا۔ نانا بنا۔ دادا بنا۔ اور سب مرحلوں کو طے کر کے پھر اسی محور پر آن ٹکا۔ محلے والے پھر اسے حافظ جی پکارنے لگے۔ وہ صرف اسی مصرف کا رہ گیا تھا کہ محلے کے بچے بچیوں کو قرآن شریف پڑھائے ۔ یا کوئی ماں اپنے منتوں مرادوں کے بچے کو لاتی تھی کہ حافظ جی اسے دعا دیں۔ اس کی عمر بھی حافظ جی کی طرح لامحدود ہو جائے۔ مصلے پر بیٹھے، تسبیح کے دانے گھماتے ہوئے وہ اس دنیا کی ہر چیز کو بھلا دیئے جاتے تھے۔ کہتے ہیں ایمان کی سلامتی کیلئے اس کی رضا پر راضی ہونا ضروری ہے۔ مگر وہ جانے کیوں کبھی سچے دل سے اللہ کا شکر ادا نہ کر سکے۔ نماز پڑھتے میں دھیان بٹنے اور غلط سجدے کرنے کی عادت بڑھاپے میں بھی نہ گئی تھی۔ وہ رات رات بھر جاگ کر توبہ کرتے۔ گھنٹوں سجدے میں پڑے ناک رگڑتے۔ دنیا کے سارے مزے تو چکھ ڈالے۔ پھر بھی دل سیر کیوں نہ ہوا۔ جیسے وہ زندگی بھر ایک گلاس ٹھنڈے پانی کا انتظار کرتے رہے ہوں۔ اور جھنجھلا کے وہ تسبیح ٹیک دیتے۔ "بوڑھے تو سبھی ہوتے ہیں مگر ابا میاں کی طرح ناک پہ غصہ کسی کے نہیں رکھا ہوتا ہے"۔ [illegible] ہوں۔ "بڑھاپا ہی سٹھیا گئے ہیں"۔ بیٹا ٹال دیتا۔ یا پھر کہیں شامت کی ماری عزیز آ کے ہنس پڑتی اور وہ کو خیال کے دو ٹیلے ۔۔۔ "ہم پر بھی جوانی آئی تھی مگر تمہاری طرح کتے نہ بنے۔ انسانوں کی طرح شرافت سے"۔ انہوں نے بڑے فخر و غرور کے ساتھ بات شروع کی مگر ختم کرنے سے پہلے ہی جیسے ہانپ ہی ختم ہو گئی ۔۔۔ ادھر کھانسی کے پھندے۔ توبہ ہے ۔۔۔ "اللہ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے"۔ انہوں نے انتہائی تسکین بخش اور اذیت ناک لہجہ میں کہا۔

پھر افیون کی پینک سی آ گئی اور کئی گھنٹے دم اُن کے درمیان سے گزر گئے۔ اس طرح کہ وہ دونوں آنکھیں میچے جانے کہاں کہاں کی سیریں کر آئے۔ "اچھا تو اب چلوں ۔۔۔" انہوں نے چونک کر یوں کہا جیسے سچ مچ حواسوں میں آ گئے ہوں۔ "کہاں جاؤ گے بیٹھو ۔۔۔" مگر پھر اماں بی کو یاد آیا کہ یہ بات آج کہنے کی تو نہ تھی ۔!

"تو میں جنین کیا کہہ رہی تھی ۔۔۔" وہ سچ مچ ماتھے پر ہاتھ رکھ کے سوچنے لگیں۔ خیالوں کا وہ اژدہام تھا جیسے لاد کر آم پر لوٹ آیا تھا"۔ اب کہنا کیا ہے ۔۔۔! حافظ جی لرزتے ہاتھوں سے لاٹھی ٹٹول کر اٹھنے کا ارادہ کرنے لگے۔ "اب ہم تم کیا کریں گے کہہ کر ۔۔۔" بات کچھ کہتے وہ یوں رک گئے جیسے کسی درد میں تڑپنے والے کو دوا یا دم حاصل ہو۔ "میں تو کہتا ہوں کہ ڈالو خیال ان حرامیوں کا۔ خواہ مخواہ غلط سلط نمازیں پڑھ رہیں گے ۔۔۔ ایمان کی سلامتی ہے کہ خوسوا کا ۔۔؟"

چابی

یوں تو گھر میں کئی ایسے تالے تھے جن کی چابیاں کھو گئی تھیں اور کئی ایسی چابیاں تھیں جن کے تالے مدت سے نہ ملتے تھے۔ لیکن کنجیوں کے چاندی ایسے چمکتے چھلے میں کسی اچھی کیس کی ایک ایسی منہ بند چابی بھی جو بڑی بڑی چابیوں میں رکتی، کھسکتی، ججھکتی، یونہی چلی آرہی تھی اور سوائے سلمیٰ کے کوئی بھی نہ جانتا تھا کہ یہ چھوٹی سی چابی چھلے میں آئی تو کیسے؟

خود سلمیٰ کو ایک عرصہ تک علم نہ ہو سکا کہ منظور کی آمد پر سارے گھر کی فضا کیسے تبدیل ہو گئی؟ وہی نصیر بھائی تھے کہ اسے ایسے سمارٹ، ایسے خوبصورت، ایسے پیارے لگتے تھے اور وہی نصیر بھائی تھے کہ بارش میں بھیگے ہوئے بازاری کتے کی طرح ان کی ساری شخصیت کان لپیٹے پھرنے لگی تھی اور سلمیٰ کو تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ گھر کی ساری دیواریں اور لمبی ہو گئی ہیں، کمرے کچھ پھیل گئے ہیں اور منڈیریں نیچے کو لٹک آئی ہیں۔

منظور کی آمد سے پہلے سلمیٰ اس دو منزلہ مکان کی شہزادی تھی۔ وہ کنگرو کے لاڈلے بچے کی طرح تھی جسے گھر کے تمام افراد حسب توفیق اپنی اپنی پوٹ میں چھپائے پھرتے تھے۔ امّی، ابّا کی تو خیر وہ لاڈلی تھی ہی۔ لیکن اپنے چچازاد بھائی کی آنکھ کا تارا بننا کوئی آسان کام نہ تھا۔ نصیر بھائی تو ایسے نفیس تھے کہ صاف ستھری پلیٹ میں انگلی پھیر کر کہیں سے مٹی نکال لاتے تھے۔ لیکن حیرانی کی بات ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ وہ نصیر بھائی کو بھی عزیز ہو گئی تھی اب تو نہ انھیں میلی جیکٹ پر دل میں اعتراض ہوتا تھا اور نہ اونچی ایڑی کی جوتی پہننے پر۔۔۔

منظور صاحب اس گھر میں کیوں آئے؟ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ ایک تو وہ نصیر بھائی کے دوست تھے۔ دوسرے بڑے شہروں میں آسانی سے رہائش کو جگہ نہ ملتی تھی۔ اس کے علاوہ منظور صاحب امّی کے دور کے رشتہ دار تھے اور حساب لگانے پر سلمیٰ نے اندازہ لگایا تھا کہ ایک طرح وہ اس کے نانا تھے۔ سلمیٰ کو اس رشتے پر تو کوئی اعتراض نہ تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ منظور صاحب اتنی کم عمر میں بالکل ناناؤں کی سی حرکتیں کرتے تھے۔ ان کی آمد سے پہلے سلمیٰ کا خیال تھا کہ اس گھر میں سوائے اس کے کسی اور کو خود پسند

ہونے کا حق نہیں پہنچتا۔ اس کی رائے اصول ہے اس کی خواہش حکم! لیکن جب منظور صاحب وارد ہوئے تو سلمیٰ کو پتہ چلا کہ اس چھوٹی سی جھیل میں کہیں سے سمندر کا مینڈک آ ٹپکا ہے۔ ہر بات پر طنزیہ مسکراہٹ ہر لمحے ماتھے پر تیوریاں!

بھلا کبھی کسی نے سنا تھا کہ سلمیٰ نے نیلا سوٹ پہنا ہو اور گھر کے سارے لوگ ماشاء اللہ ماشاء اللہ کرتے پھریں۔ نصیر بھائی ہائے ہائے کیسی باتیں کریں۔ اور منظور صاحب اخبار کی تصویروں کو مونچھیں لگاتے پھریں۔ اس روز تو اور بھی قیامت آگئی تھی نیلے سوٹ کے ساتھ اس نے سیاہ چوڑیاں بھی پہن رکھی تھیں لیکن اتنا چھنکانے بجانے کے باوجود منظور نے ان کی طرف دیکھا ہی نہ تھا۔ جب کھانے کے بعد وہ ہاتھ دھونے کے لئے سنک پر جھکی ہوئی تھی تو منظور پاس کھڑا ہاتھوں پر صابن مل رہا تھا۔ سلمیٰ نے گیلی انگلیوں سے قمیص کی بانہہ اوپر اوپر کر رکھی تھی اور چھن چھن کرتی سیاہ چوڑیاں ایک دوسری کے ساتھ کلائی پر اتر آئی تھیں لیکن نانا تیوری ڈالے صابن کی جھاگ کا گولا بناتا رہا۔ جیسے گولا بنانا ایسا ہی ضروری ہو۔ اسی لئے تو سلمیٰ ہاتھ دھوتے ہی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اسے احساس ہونے لگا تھا کہ اس گھر کا ماحول یکسر بدل گیا ہے! ---- ماحول کے تبدیل ہونے سے وہ اس قدر پریشان نہ تھی وہ تو صرف یہ چاہتی تھی کہ کسی طرح ایک بار نانا بھی نصیر بھائی بن جائے اور اسی طرح جھوٹ موٹ کے ٹٹکلوں سے سب کو ہنساتا رہے۔ اس نے ہر ممکن جتن کر دیکھا لیکن نانا اپنی رنگین ٹائیاں اور امریکن بش شرٹ پہنے متواتر تیوری چڑھائے اپنے کام پر جاتا رہا۔ آخر جب سلمیٰ کے نیلے پیلے تمام سوٹ اپنی رنگینی کھو چکے اور جھیل کی مچھلی سمندری مینڈک کے سامنے ہار مان گئی تو ایک دن سلمیٰ کو اس کی امی نے اوپر والی منزل کی صفائی کرنے بھیجا۔ نصیر بھائی کے کمرے میں سے آوازیں آ رہی تھیں۔ نانا اور وہ بڑے بجھے ہوئے انداز میں کسی کا ذکر کر رہے تھے۔ سلمیٰ دروازے کی آڑ میں کھڑی ہو گئی۔ نصیر بھائی کہہ رہے تھے۔ "تعجب ہے کہ وہ تم سے اس قدر مختلف ہے" پھر نانا بولا۔ "ہاں سبھی کہتے ہیں۔ اس کا رنگ بالکل صاف ہے اور میں تمہارے سامنے ہوں ویسے وہ ذرا موٹی ہے۔"

"کاش تم مجھے اس کی کوئی فوٹو دکھا سکتے" نصیر نے کہا۔ "میرے اٹیچی کیس میں ہے شام کو دکھاؤں گا۔"

اب نصیر بھائی نے لمبی سی سانس لی اور بڑے افسوس سے بولے "میں تو حیران ہوں تم زندہ کیسے ہو؟"

سلمیٰ کو اس بات کی قطعی امید نہ تھی۔ سارا دن وہ بستر پر پڑی روتی رہی۔ اب اس کے

جی میں اٹیچی کیس کھولنے اور تصویر دیکھنے کی تمنا کے سوا اور کچھ نہ رہا تھا۔ اس نے کئی بار کوشش کی لیکن کبھی تو دروازہ بند ہوتا اور کبھی اٹیچی کی چابی نہ ملتی۔

اس شام بادل چھائے تھے۔ نصیر اور منظور سینما دیکھنے جا چکے تھے۔ آج سلمیٰ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ نصیر سے ضرور ملے گی۔ اور اسے تسلی کر دے گی کہ وہ اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ جب اندھیرا خاصا ہو گیا اور چیزوں کے ہیولے دھندلا گئے تو وہ اوپر والی منزل میں گئی۔ اس نے منظور کے سرہانے تلے کتابوں کی میز پر سنگار میز کی درازوں میں ہر جگہ اٹیچی کیس کی چابی تلاش کی۔ لیکن اس نیم اندھیارے میں اسے چابی نہ ملی۔ ہار کر وہ اٹیچی کیس کے پاس پہنچی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے سارا دن غوطے مارتی رہی ہے اور ایک بھی سیپ ہاتھ نہیں آئی اور اب کوئی ایسی موج آئی آپ اس کے قدموں میں سیپوں کا ڈھیر لگا گئی ہے ۔۔۔ اٹیچی کیس کے تالے میں ایک منہ بند کلی ایسی چابی لگی ہوئی تھی۔

سلمیٰ نے اٹیچی کھولا ۔۔۔ اندر کئی الجھی ہوئی ٹائیاں، رنگین ریشمی رومال، رسالے، خط اور الٹی سیدھی چیزیں آپس میں گڈمڈ پڑی تھیں۔ سلمیٰ کو اس اٹیچی کیس کی چیزیں سنوارنے کا کس قدر ارمان تھا۔ اس نہ پوری ہونے والی تمنا یاد کر کے اس کی آنکھیں بھیگ سی گئیں۔ اس نے اٹیچی کے نیچے بچھائے ہوئے اخبار کو دھندلی نظروں سے دیکھ کر اٹھایا تو ایک تصویر اس کے ہاتھوں میں آ گئی ۔۔۔ شام کے اندھیرے میں اسے یہ لڑکی اور بھی پر اسرار اور خوبصورت نظر آئی۔

ابھی وہ اچھی طرح سے تصویر دیکھ بھی نہ پائی تھی کہ سیڑھیوں پر قدموں کا شور اٹھا۔ اس نے جلدی سے تصویر اخبار تلے رکھی، گڈمڈ ٹائیاں اور رومال اندر ٹھونسے اور اٹیچی کا ڈھکنا بند کر دیا۔ لیکن اٹیچی کی چابی اس کی بھیگی بھیگی ہتھیلی میں ہی رہ گئی۔ جب منظور اور نصیر آ گئے وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور مٹھی بھینچ کر بولی ۔۔۔ "جی آپ نے امی کی چابیاں تو نہیں دیکھیں؟" منظور نے کمرے کی بتی جھٹ سے جلائی اور پھر تعجب سے بولا "جی امی کی چابیاں؟"

"شام سے نہیں مل رہیں امی کہتی تھیں کہ صبح وہ ادھر بھی آئی تھیں۔"

"دیکھ لیجئے۔ شاید یہیں کہیں ہوں۔" لیکن وہ چابیاں ڈھونڈنے کے بجائے مٹھی میں سیپ کا موتی چھپائے نیچے اتر آئی۔

سلمیٰ کو کبھی بھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ عین اسی دن منظور ان کا گھر چھوڑ کر چلا جائے گا جب اس

کی اور نصیر کی منگنی ہو گی۔ لیکن ہوا یوں کہ دوپہر کے وقت جب وہ اپنے کمرے میں بیٹھی تھی تو منظور بغیر دستک دیئے اندر آ گیا اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور وہ نصیر بھائی کی طرح ہانپ رہا تھا۔

"بہت بہت مبارک ہو سلمیٰ" وہ بولا "افسوس میں رات کی تقریب پر یہاں نہ ہوں گا۔۔۔"

"آپ جانتے ہیں؟" سلمیٰ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کیوں نہیں؟"

"اس لئے بھی کہ ہم تمہارے ناتا ٹھہرے اور ناتا ایسی تقریبوں پر آبدیدہ ہو جایا کرتے ہیں۔۔۔

اور ہاں سلمیٰ تم نے میری اٹیچی کی چابی تو نہیں دیکھی کہیں؟"

اس کے جی میں آیا کہ تکیے تلے سے چابی نکال کر اس کے سامنے پھینک دے لیکن وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔

"نہیں ابھی میں نے تو نہیں دیکھی۔ کھو گئی کیا؟"

منظور کی تمام تیوریاں جیسے آنکھوں میں آنسو بن کر پھیل گئیں اور وہ آہستہ سے بولا "آپ چابی کو پوچھتی ہیں یہاں پتہ نہیں کیا کیا کھو گیا ہے؟" رعونت بھرے سمندر کی مینڈک کو یوں باتیں کرتا دیکھ کر سلمیٰ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

"اور ہاں نصیر تو پتہ نہیں کب آئے گا اسے میرا سلام اور مبارکباد دیجئے گا۔ یہ تصویر ہے اس کے پیچھے میں نے تمام تفصیلات لکھ دی ہیں۔ نصیر سے تاکید کیجئے کہ ضرور اس کا پتہ لگوائے۔"

سلمیٰ نے بڑھ کر تصویر ہاتھ میں لے لی اور اس کا چہرہ مجسم سوال بن گیا۔ منظور نے لمبی سی سانس لی اور آہستہ سے بولا "ایک یہ دکھ ہی کیا کم تھا کہ اپنی اکلوتی بہن کو [illegible]ات میں کہیں کھو آیا، اب نیلے سوٹ اور کالی چوڑیاں بھی چھوڑنا پڑیں۔" ——— سلمیٰ کے لبوں کے کنارے کانپنے لگے اور وہ بمشکل بولی

"یہ آپ کی بہن کی تصویر ہے؟" ——— منظور نے کندھے جھٹکے اور آہستہ سے اعتراف کیا "جی" پھر جیسے اپنے آپ سے کہنے لگا "پانی سر سے گزر جائے تو انسان زندہ رہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔"

ایسے کئی واقعات ہر انسان کی زندگی میں سے ہو کر گزرے ہیں۔ ان ننھی ننھی موج دار دلدلوں کا گھاؤ وقت آپ ہی آپ مندمل کر دیتا ہے۔ لیکن یہ کون جانتا ہے کہ چاندی کے چمکتے چھلے میں ایک ایسی منہ بند چابی بھی ہے جسے گھماتے گھماتے سلمیٰ کبھی بہت دُور جا نکلتی ہے اور اس کا چھوٹا سا بچہ اس کی ٹھوڑی پکڑ کر پوچھتا ہے "کیا بات ہے امی؟"

اور وہ چابی کو مٹھی میں بھینچ کر کہتی ہے۔۔۔ "کچھ بھی نہیں۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں میرے لال!"

نیلی آنکھیں

یکایک ہوا میں جان سی آگئی۔ جھجکتے تھرکتے جھونکوں کی جگہ ہوا کا ایک بالغ سلسلہ سا اطمینان کے ساتھ چلنے لگا۔ ا بید کے گرزرد پتے میرے سر پر گرنے لگے۔ پھر چونکہ پانی کو بھی ہوا کی تھپکی مل گئی تھی۔ یہ مرل پتے بھی میرے سر سے ڈھلک کر پانی کی نئی تیزی میں چپکے سنہرے دکھاتے بہتے گئے۔ اُدھر ڈل کے شمال مغربی کونے سے پہاڑ پھلانگ کر بادل کی ایک چوڑی بیل سی چڑھ آئی تھی جس نے سورج کو ڈھانپ تو نہیں دیا تھا لیکن اس پر ایک آنچل سا ڈال دیا تھا جس کی تہیں کہیں کہیں گھنی تھیں کہیں ہلکی۔ یوں تو آسمان کا آسمان تھا صاف تھا جیسے ڈل میں تیر کر منہ دھو کے ابھی ابھی اوپر چلا گیا ہو۔

حسنِ جمود کے تماشائی اپنی اپنی کشتیاں نیم جان نالوں کی طرف نکال چکے تھے اور ڈل کا پانی بجائے پہاڑوں کے عکس کو رقص میں لا چکا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ اب ایک آندھی آئے گی۔ ہوا کی نیلاہٹ ڈھلک جائے گی نیچے سے جھیل پاگل ہو جائے گی اور انسان کی کشتیوں کو ہی کیا جھیل کا پانی میل کے ذرّے ذرّے کو سو سو دور پھینکے گا اور میں ایک بہتے زلزلے ایک طوفان کی امید میں پانی کی وسعت کو کھوجنے لگا۔

دوسرے کنارے کی دھندلی لکیر تک بے چین پانی تھا اور کچھ نہ تھا۔ شمال مشرق میں صرف ایک گہرا دھبہ ہلتا ہوا دکھائی دیا۔ لیکن لگتا تھا کہ بیکار گمان نہیں ہے جیسے ڈل کا پانی اُٹھا کے پھینک دے جیسے یہی عزم تھا، اپنی حرکت تھی اور کچھ لمحوں کے بعد ہی پانی کی سلوٹوں کو چیرتی ہوئی کشمیر کی ایک ایسی چھوٹی سی کشتی اُبھر آئی جس پر نہ چھت ہوتی ہے نہ بیٹھنے کا آرام۔ کشمیری شکارے کے سامنے ایسی کو کشتی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ شکارے کے ساتھ اس کا کیا مقابلہ؟ شکارے ایک کشتی لے کے چلتے ہیں۔ پردوں گدوں اسپرنگوں کی گدیاں لے کر شائستہ سیاحوں کے لئے، پرذوق شیدائیوں کے لئے، تھکے ہوئے انسانوں کے لئے اور یہ چیز تو ڈل کی محض سبزیاں اُٹھانے کو، مچھلیاں لیجانے کو پانی کا پڑوسی، جھیل کا جفاکش کسان گھر سے تختوں بنا لیتا ہے اور اس کے سروں پر نوک تک نہیں رکھتا اسی لئے یہ دور سے ایک کشتی نہیں ایک دھبہ دکھائی دیتی ہے۔

طوفان کا ایک واضح اعلان تو ہو چکا تھا لیکن طوفان اپنے پہلے قدموں پر ہی جما رہا۔ یوں تو اپنے ایک اشارے سے ہی ڈل نے اپنا میدان خالی کروا دیا تھا لیکن اس چھوٹی سی کشتی کی یکساں تحریک سے ایسا لگتا تھا کہ یہ کائی دھبہ ایک شفاف زلزلے کو تھام رہا ہے کہ یہی کشتی سلوٹوں کو دبا رہی ہے اور انھیں ابھرنے نہیں دیتی۔ مشین کی طرح چلی آرہی تھی۔ ایک سیدھی لکیر میں ڈل کو دو ٹکڑوں میں کاٹتی ہوئی نہ دائیں نہ بائیں ایک حرکت ایسی نہیں جو کنارے کی طرف جھک جائے۔ ایسا نہیں ہو پایا کہ کبھی ذرا مڑ جائے —

اتفاق سے وہ سیدھی لکیر اسی کنارے کی طرف چلی آ رہی تھی جس پر ہم جھوم رہے تھے۔ کشتی کنارے لگی لیکن مجھ سے کچھ دور۔ میں یہ آس لگائے بیٹھا تھا کہ کشتی چلانے والا کوئی منچلا جوان ہوگا۔ لیکن اپنے بدن کے نیچے بیٹھے بیٹھے ہی میں نے کشتی کے سرے پر ایک عورت کو دیکھا۔ عورت! طوفان کا پیٹ چیرنے والی! اس کو دیکھے بالا نہ گیا۔ کنارے پر وہ کچھ پیچھے سی لگی تھی اور ایک آدھ گاہک کھڑا تھا۔ میں نے بھی سوچا کہ دیکھوں کیا بیچنے آئی ہے۔ دیکھا کہ ٹوکری پہ آنکھیں جھکائے بیٹھی ہے۔ پپوٹے ابھر رہے ہیں لیکن جونہی اس نے آنکھیں اٹھائیں اس کے پپوٹے دائیں بائیں پھیل کر بیٹھ گئے۔ اور پتلیوں سے دہکتی ہوئی ایک دنیا کے سامنے آ اٹھے۔ منہ کھولا تو لکیر کہاں؟ رسیلی سی ڈھیلی پڑ گئی۔ اور جب میں نے اس کی باہوں پر کھنچی ہوئی نیلی رگوں کو بھی دیکھا۔ میں نے اسے مائی پکارا اور پوچھا "کہو مائی کیا بیچ رہی ہو؟ ڈل کا کلیجہ! پانی کی کھیتی میں سے کیا نکلے گا؟" یہ تو بجائے کینہ بوب۔ "کینہ بوب! ارے کینہ بوب"۔ بیس برس کے بعد میں نے ایک اوچھے بچے کی طرح کینہ بوب کو پایا۔ گول گول بھرے بھرے کینہ بوب کے روبرو میری انگلیاں بھری بھری نرمی کو اسی اشتیاق سے دبانے کے لئے بے چین تھیں۔ میری زبان کینہ بوب کی مخصوص لذت کے تصور میں بے صبری کے ساتھ اپنے تالو کو چاٹنے لگی اور میں نے بغیر دام چکائے، ٹوکری میں ہاتھ کیا ڈال دیا نیلی رگوں کو اکسا دیا اور کینہ بوب والی نے اپنے کاٹھ سے ہاتھ کو میری انگلیوں میں گاڑ دیا۔ وہ گول گول بھرے بھرے کینہ بوبوں کو ایسی ترشی سے واپس نکالا جیسے انگلیوں میں لگی ہوئی تری کو بھی چھین کر لینا چاہتی ہو۔ وہ ہونٹ کیتے "کھلے" کہاں کہاں گھمے اور کیا کیا سنایا اس نے کہا کہ مفت کا مال نہیں، جو یونہی بانٹتی پھرے کہ مال پہ دام لگے ہیں۔ دن بھر کی محنت کا پھل یہی ہے مجھے لگا کہ عورت دہ کر دل کی بیتابی کو بھی روندتی ہے۔ سوچا کہ کینہ بوب کھانا ہے تو صبر سے کام لو۔ میں نے اپنے پیر پھر پانی میں ڈال دیئے اور کنارے پر بیٹھ گیا۔ "تم نے دو کینہ بوب میرے ہاتھ سے اس طرح چھین لئے" مجھے سوجھی کہ میں اسے تھوڑی سی شرم دلا دوں پھر آگے چلوں۔

"نہیں جھینپتی، تم مفت کا مال سمجھے تھے"۔ اس نے منہ کو ایک طرف چڑا کر کے پوری نفرت سے کہا "ایسے میں تو کب بنا دام کے کھانے لگا تھا؟"

"دام کب چکائے تھے؟ تم تو کھانے لگے تھے!"

"کھانے بھی لگا تھا؟"

"اور نہیں تو کیا؟" وہ ایسے بولی جیسے نیلی رگوں نے ڈل میں ایک چوکس مارا ہو۔ ایک لمحہ میں اسے گھورتا رہا۔ اس کے پپوٹے پھر ابھر آئے اور جب اس نے آنکھیں ترچھی کرکے اٹھائیں مجھے ایسا لگا کہ آنکھ کے کونے سے ڈیگ، چھچھوندر سا کھلنے والا ہے اور اس نے آنکھیں جونہی جھکائیں تو مجھے کچھ ہونٹوں پہ ایک مسکراہٹ سی لگی۔
"مجھے تو ایسا لگا تھا کہ تم کھٹکا آئے بغیر ہی کھا جاؤ گے"۔ اس نے کہا۔ دیانتداری کا ایک دور تھا

کہ جبر و کے کھلنے کی امید۔ میں نے اس سے سچ سچ کہا: "کینہ بوبوں کے سامنے میں واقعی جذباتی ہو گیا تھا" "کیوں؟" اس نے خوف بھنوؤں کو گانٹھ سی لگا دی۔

"بولے میں بیس برس کے بعد آج ان کو دیکھا ہے"۔

"کیوں؟ تم کہاں تھے بیس برس۔؟"

"میں ..... میں" مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ عورت ڈانٹا جھپٹی سی پوچھ گچھ کرنے لگی ہے۔

"ہاں میں گھر سے دور چلا گیا تھا" — "کشمیر سے دور؟"

"کینہ بوب مہنگا ہے۔ مگر یہ بتاؤ بیس برس تم کیوں نہیں لوٹے۔؟"

"کینہ بوب مہنگا ہے؟ میری ماں تو چاول کے لوٹے سے لیتی تھی۔ مٹھی بھر لوٹا دیتی تھی اور بوگن بھر کینہ بوب لیتی تھی تب" "گئے وہ وقت بھائی آجکل کشمیر کے گنوار تک بھات چاول کھاتے ہیں۔ لوٹا تو چڑیاں بھی نہیں کھاتیں لیکن تم یہ کیوں نہیں بتاتے تم بیس برس کیوں نہیں لوٹے۔ تمہاری ماں نے نہیں بلایا تمہیں؟" — "وہ جب مر گئی تھی تب ہی میں چلا گیا تھا" — کینہ بوب والی نے ایک ہاتھ سے چپو کو گاڑ دیا تھا۔ چپو اچانک ہاتھ سے نکل گرا اور وہ پانی کے بہاؤ سے چپو کو نکالنے کے لئے جھکی کشتی ہلی اور کنارے سے الگ ہو گئی۔ یہ تسلی کر کے کہ اب آندھی نہیں آئے گی وہ ایک شکارے سے بھی لوٹ نکل کر ڈل پر ہچکولے کھا رہے تھے۔ کینہ بوب والی نے کشتی پھر سے کنارے لگائی اس نے اپنے "پھیرن" کی چوڑی آستینیں جو کہنیوں پر اڑائی ہوئی تھی کھول دیں۔ اور باہوں کو ڈھک دیا۔ اس نے اپنے دوپٹے کی گانٹھ کو کھولا اور دوپٹہ اس کے کانوں پر سے ہوتا ہوا اس کے کندھوں پر ڈھک آیا۔

"بولے بیس برس کشمیر سے باہر رہا اور بیس برس میں نے ایسی جیسی ہشتبر گانٹھ نہیں دیکھی۔ اور ہیا ایک کینہ بوب نہیں کھایا" کینہ بوب والی نے بھنوؤں کا رہا سہا ابھار بھی جیسے اندر اندر چوس لیا اور میری طرف ایسے دیکھنے لگی جیسے میری آنکھوں میں میرے چھوٹے پن کو آنک رہی ہو — کم بخت کینہ بوب چھلکوں کے اندر سے پھوٹ نکلنا چاہتے تھے۔ کیا تناؤ تھا ان کا۔ کیا ڈیل ڈول تھا۔

جیسے نے ڈگری یا کر پھر آنکھیں اٹھائیں اور دیکھا کہ اس کی آنکھ میں اب دیکھی ہوئی دنیا کے وہ سارے تھے نہ پھٹکار تھی نہ تجسس تھا۔ آنسو کے ایک پھیلے ہوئے قطرے کا ہر دو چمک رہا تھا — "کیا رونے لگی؟"

"کیا کہا؟ رونے لگی ہوں؟ تم تو بچے ہو" — وہ ہنسنے لگی اور میں اس کوشش میں کھو سا گیا کہ وہ ہنس رہی ہے "تم تو واقعی بھولے بھالے ہو لیکن تم تو کینہ بوب کی بات کر رہے تھے لو کھاتے کیوں نہیں؟ — اٹھاؤ اٹھاؤ کھولے میرا تھیلا کاٹ کے جو نہ کھائے" پھر یک لخت اس کی آواز میں ترشی آگئی "اٹھاؤ کھاؤ" — دو ایک کینہ بوب اٹھا لئے۔ کمبخت کینہ بوب تو ایسے ملا جب ذہن میں یہ پریشانی تھی کہ بات کوئی ضرور ہے جو مجھے بکھیرے جا رہی ہے جھکتے ہی سوکھ جاتے ہیں کہ نیلی لو لے ہی باہوں کی گولائی کو گانٹھیں لگا دی ہیں کہ نظروں میں جو ٹھہرا ہے وہ برا نا نہیں کہ آنکھوں کے کونوں سے جو کبھی کبھی جھروکا سا کھل جاتا ہے اس کے پیچھے کوئی گھٹ رہا ہے۔ کینہ بوب والی مجھے ایسے گھور رہی تھی جیسے وہ مجھ سے مایوس ہو گئی ہو — "تم کینہ بوب یہ لوٹا رہے تھے"

آپ حیرت نہیں

اسپتال کی سیڑھیوں پر اور چھوٹا پاشی گھر میں چیونٹیوں کے بل پر سوتے رہے اور آخر ایکدن —— ۲۸ مارچ کی شام ——" اور مدن چپ ہو گیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ رونے سے ذرا اِدھر اور گھگھی سے ذرا اُدھر پہنچ گیا۔ اندو نے گھبرا کر مدن کا سر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ اس رونے نے پل بھر میں اندو کو بھی اپنے پن سے اِدھر اور بیگانے پن سے اُدھر پہنچا دیا تھا .... مدن اندو کے بارے میں کچھ اور بھی جاننا چاہتا تھا لیکن اندو نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے اور کہا "میں تو پڑھی لکھی نہیں ہوں جی —— پر میں نے ماں باپ دیکھے ہیں، بھائی اور بھابیاں دیکھی ہیں، بیسیوں اور لوگ دیکھے ہیں اس لئے میں کچھ سمجھتی بوجھتی ہوں ... میں اب تمہاری ہوں —— اپنے بدلے میں تم سے ایک ہی چیز مانگتی ہوں۔"

روتے وقت اور اس کے بعد بھی ایک نشہ سا تھا۔ مدن نے کچھ بے صبری اور کچھ دریا دلی کے ملے جلے شبدوں میں کہا ——" کیا مانگتی ہو؟ تم جو بھی کہو گی میں دوں گا۔"

"پکی بات؟" اندو بولی۔

مدن نے کچھ اتاولے ہو کر کہا "ہاں ہاں —— کہا جو، پکی بات۔"

لیکن اس بیچ میں مدن کے من میں ایک وسوسہ آیا —— میرا کاروبار پہلے ہی مندا ہے اگر اندو کوئی ایسی چیز مانگ لے جو میری پہنچ ہی سے باہر ہو تو پھر کیا ہوگا؟ لیکن اندو نے مدن کے سخت اور پھیلے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ملائم ہاتھوں میں سمیٹتے اور ان پر اپنے گال رکھتے ہوئے کہا۔

"تم اپنے دکھ مجھے دے دو۔"

مدن سخت حیران ہوا۔ ساتھ ہی اسے اپنے آپ پر سے ایک بوجھ اترتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے پھر چاندنی میں ایک بار اندو کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ نہ جان پایا۔ اس نے سوچا یہ ماں یا کسی سہیلی کا رٹا ہوا فقرہ ہوگا جو اندو نے کہہ دیا۔ جبھی ایک جلتا ہوا آنسو مدن کے ہاتھ کی پشت پر گرا۔ اس نے اندو کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا "دیے ——!" لیکن ان سب باتوں نے مدن سے اس کی بہیمیت چھین لی تھی۔

مہمان ایک ایک کر کے سب رخصت ہوئے۔ چکی بھابی دو بچوں کو انگلیوں سے لگائے سیڑھیوں کی اونچ نیچ سے تیسرا پیٹ سنبھالتی ہوئی چل دی۔ دریا باد والی پھوپھی جو اپنے "نو لکھے" ہار کے گم ہو جانے پر شور مچاتی، واویلا کرتی ہوئی بیہوش ہو گئی تھی اور جو غسل خانے میں پڑا مل گیا تھا، جہیز میں سے اپنے حصے کے تین کپڑے لے کر چلی گئی۔ پھر چاچا گئے، جن کو ان کے جے پی ہو جانے کی خبر تار کے ذریعے سے ملی تھی اور

تم میرے دل کو ٹھنڈک پہنچانا چاہتے ہو تو ان کو نوچ نوچ کے کھاؤ"۔ میں نے گینہ بوب کی ٹوکری کو پیچھے ہٹا کر اس سے کہا۔
"پہلے بتاؤ! تم کہاں رہتی ہو؟" "میں؟" میں نے دوپٹے کو پیچھے کی طرف فوراً گانٹھ لگا دی اور آستین الٹ دی اور
ٹوکری کو میری طرف پھر دھکیلا۔ "اٹھاؤ جتنے اور لینے ہیں مجھے گھر جانا ہے۔ جو بچیں گے انھیں میں کل بیچوں گی
اٹھاؤ۔" میں نے ٹوکری کو پھر اپنے سامنے سے ہٹا کر پوچھا۔ "گینہ بوب والی تمھیں کس بات کا دکھ ہے؟" اس نے حیرت سے مجھے
گھورا۔ "دیکھو ہو میرے دشمنوں کو۔ لیے میرا کلیجہ ٹھنڈا کر سکا ہے۔ تم مجھے نہیں جانتے۔ جب کسی کا حال نہیں پوچھ سکتے تو مجھے کیا
ملے تو میں کسی کی دو آنکھیں نوچ لوں اسی طرح جس طرح ڈنٹھل کو گینہ بوب اٹھا لیتی ہے چلو۔ تم اور گینہ بوب نہیں لیتے؟" میں
نے کہا۔ "گینہ بوب والی! تمہارے گھر میں اور کون ہے؟" "اللہ تعالیٰ کا کرم ہے سب ہی لوگ ہیں۔ اٹھاؤ جے
گینہ بوب اور لینے ہیں۔" مجھے احساس ہونے لگا کہ میرے پاس بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے جو کچھ پوچھنا ہے جلدی
جلدی پوچھ لوں۔ "تمہارا گھر والا کہاں ہے؟" "ڈل کے پیٹ میں ہے۔" "افسوس ڈوب گیا تھا کیا۔" میں نے جلدی جلدی
پوچھا۔ "ایک روز زور کی آندھی نے اسے اچانک پانی کے بیچ میں پکڑ لیا تھا۔ وہ ہاتھ کے کنگن میرے لیے بنوانے
لانے گیا تھا۔ کیونکہ رحمان میرے پیٹ میں تھا۔ آندھی اچانک آ گئی تھی اور میں نے اپنے کنارے پر سے اس کا
دعا مانگ کے ساتھ لڑتے پایا وہ لپک کر اٹھی اور جیسے جھپٹی گینہ ڈل سے۔" "پھر وہ ڈوب گیا؟" "میں نے دور سے
اسے ڈوبتے دیکھا تھا۔ آندھی میں ڈل کے پانی پر مٹی کہاں اڑتی ہے؟ دھول کہاں اڑتی ہے؟ سب کچھ دکھائی
دیتا ہے۔" میں نے ڈل کے پھیلاؤ پر نظر اٹھائی۔ سلوٹیں کہاں؟ اب تو نیلے نیلے چوڑی سی بھاگ رہی تھیں۔ ہوا بھی تھم گئی
تھی جیسے اوپر کہیں بھاگنے کا راستہ ڈھونڈ رہی ہو۔ "پھر تم اکیلی رہ گئی تھیں کیا؟" "نہیں ابھی ماں کو رحمان
ہو گیا تھا۔" "ہاں رحمان اور میں۔ رحمان نے تو باپ کو دیکھا بھی نہ تھا اور میں بھی اسے بھول گئی۔" نہ جانے اس
کی کتنی چوٹیں اندر اندر کیا ہو گیا کیونکہ دوپٹے کی گانٹھ اپنے آپ کھل گئی اور اس نے اسے باندھنے کی پھر کوشش کی
لیکن تم بھی کتنے بھولے ہو غیروں کی کہانی سننا چاہتے ہو۔" "تم اب یہ پوچھو گے کہ رحمان کہاں ہے؟ رحمان کو بھی ڈل لے
گیا۔ نہیں تم غلط سمجھے۔ وہ ڈوب گیا ہے لیکن زندہ ہے۔" "گینہ بوب والی تم کیا کہہ رہی ہو؟" "تو سنو! میرا گھر والا بھی جب
آدمی تھا وہ ڈل کا متوالا تھا۔ جانے ڈل کی اس نیلاہٹ نے اسکی زندگی میں بھی کیوں موہ لیا تھا۔ ڈل کی کشتی سے تھک کر جب آتا تھا
تو مجھے ایک بچی کی طرح گود میں لیتا تھا۔ اور کہانی کہے کہ وہ سیر ہو جاتا تھا۔ یونہی تو ہر وقت سونے ہی تو کتنی حسین پرسی لگتی ہو
ہے۔ کہتا تھا آنکھیں نیلی "نہیں مجھے گود میں لیا۔ اور میں نیلی آنکھوں والی باتو مذاق سمجھتی۔ سمجھ لیتی۔ سو سال بعد خود ہی ڈل
گود میں ایک نیلی آنکھوں کو خوبی والا۔ اور رحمن کو اسکی آغوش میں ڈال دیا۔" "تب سے میں اکیلی رہ گئی ہوں اور ہر طرف اسی جھیل کے پانی
میں گھومتی رہتی ہوں کبھی گول گول آنسوؤں کے ڈھیلے سے گینہ بوب کو نوچ اٹھاتی ہوں کبھی اسکی گہرائیوں سے کنول کو کھینچ نکالتی ہوں اور
آندھی کی تلاش میں بھٹکتی ہوں اور اسی جگہ ڈل کے بیچ میں گھنٹوں گھومتی ہوں لیکن بے شرم آندھی نہیں آتی۔ آتے آتے
رک جاتی ہے۔ چار سال ہوئی، چار سال بچہ ہوتا رہا۔" کشتی اب پانی میں آ چکی تھی اور گینہ بوب والی نے پانی میں چپو ڈال
دیا تھا۔ "میں گھر گئی اور رحمن کے لیے ایک نیلی آنکھوں والی دلہن لائی۔ بس وہ ان ہی آنکھوں میں ڈوب گیا۔ وہ اسے لے
لے گئی۔ اور اس نے مجھے اکیلا چھوڑا۔" کشتی دھیرے دھیرے دور اسی دھندلی لکیر کی طرف واپس لوٹ چلی جہاں سے سلوٹوں پر ابھر
آئی تھی اب آسمان کہاں اتنا صاف تھا جیسے ڈل پلا کر آگیا ہو یا منہ دھو کے اور چلا گیا ہو اور اب یہ بات پہلے سے زیادہ صاف تھی

بجھتے چراغ

سائیں داس شام کو چھ بجے گھر لوٹا۔ تھکا ماندہ اور پریشان سا سائیکل کو ڈیوڑھی میں دیوار کے ساتھ لگا کر اندر پہنچا۔ برآمدے میں اس کی بیوی چارپائی پر اپنے آگے بہت سارے شلغم بکھیرے انھیں ایک بڑی تھالی میں کاٹ کاٹ کر رکھتی جا رہی تھی۔ خاوند کو دیکھ کر وہ مسکرا دی مگر اس کی مسکراہٹ دوسرے ہی لمحہ بجھ بجھ گئی۔ خاوند کی طرف حیرانی سے دیکھا اور پوچھا "خیریت تو ہے"۔

سائیں داس ایک لمبی "ہوں" کہہ کر نکٹائی کی گانٹھ کھولتا ہوا سیدھا کمرے کے اندر چلا گیا۔ کوٹ اور پتلون اتار کر کرسی کی پشت پر ڈال دئے اور ایک رنگدار تہمد باندھ کر آرام کرسی میں دھنس گیا۔ اتنے میں اس کی بیوی بھی اندر آ گئی شلغم اور چھری سمیت۔

"بتایا نہیں، بات کیا ہے؟"

"بات وہی ہے کوئی نئی تھوڑی ہے!" سائیں داس نے ایک لمبی سانس لے کر کمرے کی پرانی چھت کو گھورا۔ بوسیدہ دیمک لگی کڑیاں چھت کے بوجھ سے ہر وقت گر پڑنے کے لئے تیار نظر آتی تھیں۔ کمرے کے وسط میں دیوار کے اندر سنگ مرمر کا ایک کتبہ نصب تھا جس پر سیاہ جلی حروف میں "اللہ اکبر" لکھا ہوا تھا۔

"آج پھر کلیم کے دفتر کی خاک چھانی ہے۔ دفتر سے دو گھنٹے کی چھٹی لے کر گیا تھا وہاں لیکن لگ گئے پورے چار گھنٹے۔"

"پھر؛ کچھ ملا مکان کی مرمت کے لئے؟"

"خاک! کہتے ہیں ایک ہفتہ بعد آؤ۔"

"بتایا نہیں سردیوں کی بارشیں شروع ہو گئیں تو مکان گر جائے گا؟"

"ان کی بلا سے! ان کے نزدیک ایک رفیوجی کنبہ تو ختم ہو جائے گا۔ اگر سارے

سے سارے ملبے کے نیچے آکر دب گئے تو کلیم تو نہیں دینا پڑے گا گورنمنٹ کو!"

"اندھیر ہے بالکل اندھیر! اگر کچھ ملنے کی امید ہو تو اپنے پاس سے ہی کچھ خرچ کر ڈالیں۔"

"کیا بھروسہ دفتری کارروائیوں کا! ملتے ملتے بھی سال دو سال تو گذر جائیں گے۔"

اس کی بیوی پاس ایک پلنگ پر بیٹھ گئی۔ بولی "آج ٹھاکر داس اور اس کی بیوی آئے تھے، بیٹے کی شادی کا کارڈ دے گئے ہیں"۔ "اچھا!"

"آپ تو تھے نہیں۔ میں نے بھی مناسب نہیں سمجھا کچھ کہنا سننا۔ بس کارڈ لے کر رکھ لیا۔ جانے سرلا نے کہاں رکھ دیا ہے"۔ اس نے سر گھما کر سرلا کو پکارا۔

"سرلا — ! بیٹی سرلا!"

کہیں سے ایک باریک سُریلی آواز سنائی دی۔ "آئی ماتا جی!" اور پھر پاؤں میں پہنے ہوئے ربڑ سول سلیپروں سے ٹپ ٹپ کی آواز پیدا کرتی ہوئی جس میں ایک رقص کا سا ترنم اور نظم تھا، سرلا کمرے اندر آگئی۔ باپ پر نظر پڑی تو مسکراتی ہوئی اُدھر بڑھ گئی پھر کرسی کی پشت پر پڑے ہوئے باپ کے کپڑے دیکھے تو انھیں اٹھا کر دیوار پر لٹکاتی ہوئی بولی "کہئے ماتا جی!" "وہ کارڈ کہاں ہے ترلوک کی شادی کا، جو آج دوپہر کو دے گئے تھے — !" — "یہاں رکھا تو ہے!" وہ لپک کر دیوار پر لٹکی ہوئی ایک تصویر کے پیچھے سے ایک سفید چوڑا سا لفافہ نکال لائی۔ سائیں داس چند لمحوں تک کارڈ پڑھنے میں محو رہا۔ اس کی بیوی شلغم کا چھلکا دھیرے دھیرے اُتارتی ہوئی بولی "کیا خیال ہے، جائیے گا شادی میں؟" — "جی تو نہیں چاہتا۔ آج تک انھوں نے ہمارے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے اسے دیکھ کر یہ کارڈ لینا ہی نہیں چاہیئے تھا"۔ یہ کہہ کر سائیں داس نے اپنے سُرخ و سفید کلین شیو چہرے پر اپنا ہاتھ پھیرا۔ اس کی انگلیاں ٹھوڑی کے نیچے پھر سے نکلے ہوئے سفید بالوں کو کھجانے لگیں۔ اونچی اُٹھی ہوئی ناک اور بھنچے ہوئے ہونٹوں سے اس کی سخت ناراضی کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ اسی طرح تھکی تھکی اور اُکتائی ہوئی آواز میں بولا — "اسی مکان کا قصہ لے لو۔ ہماری الاٹمنٹ کینسل کرانے میں ٹھاکر داس نے کتنی کوشش کی! سر توڑ کوشش کی تھی نا! لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ ہمارے ساتھ ایسا حاسدانہ رویّہ اختیار نہ کیا ہوتا اس نے تو آج ہم دونوں ایک دوسرے کے کتنے قریب ہوتے! یاد ہے تم نے ایک بار میرے سامنے اپنی سرلا اور ان کے ترلوک کا بھی ذکر کیا تھا!"

سرلا اپنا نام سن کر باہر نکل گئی — سر جھکا کر — ربڑ سول کے سُرخ سلیپروں کا مترنم آہنگ اب

سُنائی نہیں دیا۔ مایوسی میں ڈوبی ہوئی ایک محتاط چال تھی بس!

"ہاں وہ تو تب کی بات ہے جب رام دیوی آٹھوں پہر میرے گھر میں گھسی رہتی تھی۔ جب دیکھو بہن یہ بات ہے، بہن وہ بات ہے۔ سوئی میں تاگا بھی اسے ڈالنا ہوتا تو مجھ سے پوچھے بغیر تاگا نہ ڈالتی۔ ہر بات پر دوڑتی بھاگتی چھپاک سے میرے پاس آجاتی۔ اب ہی پڑوس ہے، وہی میں ہوں اور وہی رام دیوی ہے! لیکن مہینوں گذر جاتے ہیں ایک دوسرے کی شکل دیکھے ہوئے۔ حضرت گنج میں ایک کان کیا کھول لی، دماغ ہی آسمان پر پہنچ گیا۔" سائیں داس کی بیوی نے ایک شلغم کی جلدی جلدی کئی ڈلیاں بنا ڈالیں اور کاٹ کاٹ کر اپنی جھولی میں ڈالتی گئی۔

سائیں داس بولا۔ "روپیہ محبت کا دشمن ہے! روپیہ پا کر انسان قریبی رشتوں کو بھی بھول جاتا ہے۔ ہم تو محض ایک شہر کے تھے۔ پاکستان سے نکل کر یہاں اتفاق سے پڑوسی بن گئے تھے۔"

"ہم لوگ بھی کتنے عجیب ہیں۔ اس شہر میں جس کی کئی لاکھ کی آبادی ہے اپنی طرف کے ہمارے مشکل سے تیس چالیس گھر ہوں گے۔ اس پر بھی کبھی مل نہیں بیٹھتے۔ ایک دوسرے کے ساتھ نام کو بھی ہمدردی نہیں رہ گئی!" یہ کہہ کر سائیں داس کی بیوی نے اپنا کان کھجایا۔ اطمینان نہ ملا تو کان میں سے طلائی جھمکا اتار کر کان کے سوراخ کو انگلیوں سے سہلانے لگی۔ اس کے کانوں میں کنارے کنارے کئی سوراخ تھے۔ کسی زمانے میں اس کے کان طلائی بالیوں کے بوجھ سے پھلوں سے لدی ہوئی شاخوں کی طرح جھکے جھکے رہتے ہوں گے۔ وقت کے ساتھ سمجھوتہ کر کے اس نے اپنے کانوں میں صرف ایک ایک جھمکا پہننا شروع کر دیا۔ اس کے خاوند نے کوئی جواب نہ دیا۔ آنکھیں بند کر کے سوچتا رہا۔ وہ اٹھ کر باہر جاتی ہوئی بولی ۔۔۔ "کھانا پکاؤں۔ آکر لے پریم اور انکو بھی آتے ہوں گے ۔۔۔"

"کہاں گئے ہیں؟"

"کہیں یار دوستوں میں گپ لڑا رہے ہوں گے باہر"۔

وہ باہر چلی گئی۔ سائیں داس سوچتا رہا۔ آنکھیں بند کر کے ٹھاکر داس کے ساتھ اپنے تعلقات پر غور کرتا رہا۔ گذشتہ دس سال انہوں نے اس شہر میں گذار دئے تھے۔ وقت پر لگا کر اڑ چکا تھا۔ دیکھتے دیکھتے دس سال گذر گئے تھے۔ تب دونوں کے بچے چھوٹے چھوٹے تھے۔ آج بڑے ہو کر شادی کی عمر کو پہنچ گئے تھے۔ ٹھاکر داس بیٹے کی بارات لے کر تین سو میل دور ایک دوسرے شہر جائے گا۔ سردیوں کا موسم، تکرانی سفر حلقہ بدلیے سنجوگ کی بات بھی ہوتی ہے! سائیں داس کے کانوں میں چند آوازیں آئیں۔ قدموں کی آواز

بولنے کی آوازیں اس نے آنکھیں کھول دیں۔ سرلا ٹھاکر کے صحن میں کچھ لڑکیاں اس کی بیوی کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔ وہ چلی گئیں تو اس کی بیوی نے اندر آ کر بتایا۔ ”ٹھاکر داس کی لڑکیاں آئی تھیں بلانے۔ آج ان کے ہاں گانا بجانا ہے۔ میں نے کہہ دیا میرے تو جوڑوں کا درد رہتا ہے سرلا کو بھیج دوں گی۔“ یہ کہہ کر وہ پھر رسوئی میں جا بیٹھی۔۔۔ سائیں داس پھر سوچ میں پڑ گیا۔ بالکل ڈوب گیا۔ سرلا اگلے سال بی۔اے کرے گی۔ اگلے سال اسے پراویڈنٹ فنڈ میں سے قرض لینا ہوگا۔ کلیم کا روپیہ جانے کب تک ملے۔ لڑکی کی شادی ضروری ہے۔ بھگوان کو منظور ہوا تو اسے یہی مکان کلیم کے عوض مل جائے گا۔ چار بڑے بڑے کمرے ہیں۔ ایک بڑا دالان اور صحن ہے۔ کسی بچارے مسلمان کا مکان ہے۔ وہ بھی پاکستان میں کسی ہندو کے مکان میں اپنی عزت آبرو سمیٹے رہ رہا ہوگا۔ اسے بھی کئی غم ستاتے ہوں گے۔ اس کی بھی کئی فکریں ہوں گی۔ وہ بھی اپنے ڈھنگ کے بدلے ہوئے دنوں کی شکایت کرتا ہوگا۔ سب دن ہوت نہ ایک سمان! مصیبتیں بادلوں کی طرح زندگی کے آسمان پر چھا جاتی ہیں۔ بادل برستے ہیں، گرجتے ہیں، تھک جاتے ہیں، لوٹ جاتے ہیں، اڑتے اڑتے کہیں کے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔ مطلع صاف ہو جاتا ہے۔ ہر طرف دھوپ پھیل جاتی ہے۔ جل تھل دھرتی کو زندگی کی آنچ بخشتے، تخلیق میں مدد دیتے۔ نئی فصلیں، نئے پھول، نئی بہاریں! سائیں داس آنکھیں بند کئے ہوئے مسکرا دیا۔ آنکھیں نیم وا کر کے دیوار پر لگے ہوئے اللہ اکبر کے کتبے کو دیکھا۔ اسے دیکھتا ہی رہا۔ سیاہ جلی حروف ابھر کر اس کے قریب آ کھڑے ہوئے۔ اس کی آنکھوں کے بالکل سامنے آ گئے۔ پھر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہونے لگے۔ سب حروف مل کر ایک لکیر بن گئے۔ اونچی سیدھی لکیر۔ زمین سے اٹھ کر آسمان تک پہنچنے والی لکیر۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے ڈھلک پڑے۔ اس نے اپنی آنکھیں بند رکھیں۔ بند کئے لیٹا رہا۔ اچانک اس کے کانوں میں پھر کچھ آوازیں آئیں۔ بولنے اور چلنے کی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ آنسو پونچھ ڈالے۔ سر اونچا کر کے دیکھا۔ اس کے دونوں لڑکے چلے آ رہے تھے۔ سرخ و سفید مسکراتے ہوئے چہرے۔ خاص انداز سے ماتھے پر بکھرے ہوئے بال۔ ٹخنوں سے اونچی اونچی پتلونوں میں ہاتھ ڈالے۔ پیچھے پیچھے سرلا تھی، ماں کی طرح پتلی اور اونچی۔ پھولدار کریپ کی لمبی قمیص کے اوپر گہری سرخ شنیل کی کوٹی پہنے اور سنہرے بالوں کی لمبی چوٹی کو ہاتھ کے گرد لپیٹتی ہوئی۔

”پتاجی! ہم ڈگو کی بارات میں جائیں گے!“

”ہاں پتاجی! ہم ضرور جائیں گے۔ نہیں گئے تو ترلوک ناراض ہو جائے گا۔“

سرلا بھائیوں سے آگے بڑھ کر باپ کے پاس آ بیٹھی۔ آرام کرسی کے بازو پر۔۔۔ سائیں داس کی قمیص کا بٹن بند کرتی ہوئی بولی۔ ”پتاجی! میں بھی جاؤں گی۔ راج مجھے ساتھ لئے بغیر جائے گی نہیں۔ آپ جانتے ہیں وہ میری کتنی گہری دوست ہے۔ کلاس فیلو بھی ہے۔“ سائیں داس نے سب کی طرف انکار کے طور پر دیکھا اور پھر بلند آواز سے بیوی کو پکار کر بولا۔ ”لو اور سنو! یہ سب کے

سب بارات میں جائیں گے جیسے وہ لوگ سچ مچ انھیں ساتھ لئے بغیر جائیں گے نہیں۔

اسکی بیوی نے دھیمے سے جواب دیا۔ "ان کا تو دماغ خراب ہے!"

"نہیں پتاجی! ہم ضرور جائیں گے۔ شادی کے بہانے میرٹھ بھی دیکھ لیں گے۔ یہ شہر ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔"

"اگر سیر و تفریح ہی کرنا ہے تو ویسے کبھی چلے جانا' گرمیوں کی چھٹیوں میں۔"

"نہیں پتاجی! میرے سب فرینڈز جا رہے ہیں۔ پتاجی پلیز!"

"اچھا اچھا! اب یہاں سے جاؤ۔ سوچیں گے ابھی تو کئی دن پڑے ہیں۔"

"کہاں کئی دن پڑے ہیں؟ پرسوں بارات جا رہی ہے شام کی گاڑی سے۔"

"بیٹا! ان کے ساتھ ہمارے تعلقات ایسے نہیں ہیں کہ شادی بیاہ میں سب کے سب شریک ہو لیں۔ وہ بھی کہیں گے کیسے احمق ہیں۔" اس کی بیوی بھی رسوئی میں روٹی پکاتے پکاتے ہنس کر بولی۔ "سچ پرائی احمق بچے!"

تینوں بچے مایوس ہو گئے۔ کھانے کے وقت بھی سب اداس اور چہرے لٹکائے بیٹھے تھے۔ نہایت ہی بے دلی سے کھانا کھا رہے تھے۔ پڑوس سے لڑکیوں کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ ڈھولک بج رہی تھی گھنگھرو چھنک رہے تھے۔ کوئی لڑکی لہک لہک کر گا رہی تھی۔ "من ڈولے میرا تن ڈولے میرے دل کا گیا قرار رے...!" گانے کی آواز سن کر تینوں کی نگاہیں بار بار اپنے ماں باپ کی طرف اٹھتیں اور پھر ایک دوسرے سے ٹکرا کر جھک جاتی تھیں۔ سرلا کے لئے یہ سوچ کر لقمہ نگلنا بھی مشکل ہو جا رہا تھا کہ جانے اسے لڑکیوں کی گانے کی محفل میں جانے کی اجازت ملتی ہے یا نہیں! لیکن اچانک اس کی ماں نے یہ کہہ کر سب کی مایوسی خوشی میں بدل دی۔ "کھانا کھا کر ذرا دیر کے لئے وہاں چلی جانا۔ سرلا!" سرلا کھانا اسی دم ختم کر کے جلدی جلدی پانی کے دو گھونٹ حلق سے نیچے اتارتی باہر بھاگ گئی۔ پریم اور اشوک بھی جلدی جلدی اٹھ کر باہر چل دئے۔ سائیں داس نے پوچھا "کہاں جا رہے ہو؟" — تو جواب دیا "ابھی آتے ہیں پتاجی! ذرا ترلوک کے ہاں کچھ دوست جمع ہیں مل کر لوٹ آئیں گے۔"

سائیں داس حقہ بھر کر کمرے میں آ بیٹھا۔ صبح کا اخبار سامنے رکھ لیا۔ اخبار کا ایک آدھ صفحہ وہ اور رات کو اسی وقت پڑھنے کے لئے صبح چھوڑ دیتا تھا۔ اسکی بیوی بھی رسوئی کے کام کاج سے فرصت پا کر اپنے بستر میں آ گھسی۔ ہاتھ میں تیل کی شیشی بھی تھی جسے گرم کر کے لائی تھی۔ انگلیوں پر تیل لگا کر گھٹنوں پر ملنے لگی۔ پڑوس میں گانے کی آواز اونچی ہوتی گئی۔ سائیں داس کی بیوی بولی۔ "آجکل تو بس سڑی فلموں کے گانے ہی گائے جاتے ہیں ہر موقع پر۔ میرے تو سن سن کر کان پک گئے ہیں۔"

"ہوں!" سائیں داس حقے کی گڑگڑاہٹ اور اخبار کی خبروں میں کھویا ہوا تھا۔ کچھ سن نہ سکا۔ اسکی بیوی نے

بھی یہی بات نہیں ہے، اُن گھٹنوں کی مالش کر چکی تو چکنے ہاتھ سر کے بچے ہوئے بالوں پر ملے، جو سفیدی لگ کر کھچڑی کے رنگ کے ہوگئے تھے۔

پڑوس کی دیوار سے ایک نہایت ہی سریلی آواز تیرتی ہوئی اس کمرے میں آپہنچی۔ "سیاں جھوٹوں کا بڑا سردار نکلا۔"

یہ آواز سُن کر سائیں داس نے اخبار ہاتھ سے جھٹک دیا اور گرج کر بیوی سے کہا۔ "جاکر سرلا کو بلا لاؤ۔ کس کی شادی پر گا رہی ہے، بہو ہمارے کون لگتے ہیں؟" بیٹی کا گانا سن کر سائیں داس کی بیوی کے چہرے پر بھی برہمی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے گھٹنوں پر ابھی ابھی مالش کی تھی۔ سرلا کو گانے سے منع کرنا بھی ضروری تھا، اور کون جاتا وہاں! اس نے دونوں گھٹنوں پر گرم گرم اونی پٹیاں چڑھا دیں اور پھر آہستہ آہستہ چل کر باہر نکل گئی۔

جب تک سرلا کے گانے کی آواز آتی رہی سائیں داس اخبار کی طرف متوجہ ہو سکا نہ حقے کی نے کی طرف۔ چند منٹ کے بعد سرلا کی آواز آنی بند ہو گئی۔ سائیں داس نے اخبار پھر اپنی طرف سرکا لیا اور حقہ گڑگڑانے لگا۔ ابھی وہ چند ہی سطور پڑھ پایا تھا کہ اس کے کانوں میں ایک عجیب سی آواز آئی۔ بالکل ہی عجیب سی آواز، جیسے بہت دور سے کوئی آواز آتی ہو، آسمان میں تیرتی ہوئی اور کئی پہاڑوں پر سے پرواز کر کے آجانے والی پنجابی آواز۔ ڈھولک اور گھنگھرو دور کے ٹل پر کوئی عورت گا رہی تھی۔

میری نئی ماہیا تو رل لوے ۔ ساڈا یوں کرنیدا لوے ۔ بھاویں جانے تے بھاویں جائے ۔ میں تیرا ڈھول جوانیاں مانے

سائیں داس نے اخبار پھر ایک طرف رکھ دیا۔ حقے کی نے اس کے ہونٹوں کے ساتھ لگی رہ گئی۔ وہ بہت اداس ہو کر اُس گیت کو سننے لگا۔ کتنی صاف، شیریں اور تیز آواز تھی، جیسے سیکڑوں اندھیرے اور میلوں تک پھیلی ہوئی خاموشی کا جگر چیرتی ہوئی اس کے جگر میں دھنس گئی تھی۔ اُسے کون بلا رہا تھا؟ اس کے خوابیدہ احساسات پر کون دستک دے رہا تھا؟ آج سے کئی برس پہلے اس نے اسی قسم کی آواز سُنی تھی۔ یہی بول سُنے تھے۔ جب وہ بیس برس کا گبرو تھا، سر پر لمبے لمبے پٹے رکھتا تھا، ننھی ننھی مونچھیں تھیں۔ پنجاب میں دریائے سندھ کے کنارے راحت بخش، خنک اور سنہری ریت کے ٹیلوں کے درمیان لمبے لمبے علاقے میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ماہیا گایا کرتا تھا۔ اس کے لبوں سے نکلے ہوئے بول جب چاندنی راتوں میں اڑتے اور گونجتے ہوئے جوان کنواریوں کے کانوں سے جا ٹکراتے تو وہ چھتوں پر سوتے سوتے چونک پڑتی تھیں اور منڈیروں پر چڑھ کر دور حد نظر تک چاندنی میں نہائے ہوئے ریت کے ٹیلوں کی طرف بہت بےچینی سے گھورنے لگتی تھیں۔

اچانک سائیں داس کو یاد آیا، اس کی بیوی سرلا کو بلانے کے لیے گئی ہوئی تھی۔ ابھی تک لوٹ کر نہیں آئی تھی۔ کیا اس نے بھی یہ آواز سُنی تھی؟ وہ بھی سُن لیتی تو حیران رہ جاتی۔ اس کی مانند اپنے آپ کو چند لمحوں کے لیے بھول جاتی تو وہ پانی بھرنے والی مٹیار بن جاتی، جو تیز تیز قدم چلتی جاتی۔ "بھاویں جانے تے بھاویں نہ جانے، میں تیرا ڈھول جوانیاں مانے۔"

یہ آواز محض آواز ہی نہیں تھی، کوئی کشش تھی، کوئی غیبی طاقت تھی جو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ ایسے پکار رہی تھی، صدا دے رہی تھی، دعا دے رہی تھی۔ لمبی عمر پانے کی دعا، اس کے سامنے اپنے دل کی کیفیت بیان کر رہی تھی۔ چاندنی راتیں، کنوؤں پر جا کر پانی بھرنے کے بہانے اس سے ملنے کی التجا کر رہی تھی۔ اس کی جوانی کا واسطہ دے رہی تھی۔

بکار رہی تھی۔ اسے یاد تھا۔ تیس کٹھن اور طویل سال گزر جانے کے باوجود اسے وہ ایک ایک لمحہ یاد تھا۔ عشق اور اضطراب میں گذری ہوئی ایک ایک کیفیت اس کے ذہن میں ترو تازہ تھی۔ اپنی پوری دیوانگی اور شدت کے ساتھ۔ وہ کیسے بھول سکتا تھا ان لمحوں کو! وہ آہستہ سے اٹھا۔ تہمد کو اچھی طرح کس کر کمر کے گرد باندھا۔ بغیر کھانسے بغیر کوئی آواز پیدا کئے دبے پاؤں قدم گھسیٹتا ہوا صحن میں سے گزرا۔ پڑوس کی دیوار کے پاس پہنچا۔ اندھیرے میں دیوار کے ساتھ بنے ہوئے تنور کو ٹٹولا اس کی مضبوطی کا اندازہ کیا۔ ایک لکڑی کے صندوق میں سے کپڑے نکال کر صندوق کو تنور کے اوپر رکھ دیا اور پھر سنبھل سنبھل کے اس کے اوپر چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب اس کا سر دیوار کے اوپر نکل سکتا تھا۔ وہ جھانک کر دیکھ سکتا تھا لیکن اس نے ایسا کرنا مناسب نہ سمجھا۔ سر جھکا کر گیت گانا سننے پر اکتفا کی۔ گانا اس کی روح کی پیاس کو بجھا بھی رہا تھا اور بھڑکا بھی رہا تھا۔ وہ دیکھ بھی نہیں سکتا تھا کہ کون گا رہی تھی۔ وہ اس کی صرف کانوں میں میٹھا رس ٹپکانے والی آواز سن سکتا تھا۔

اساں ادھے نہ ہی ساڈا کچھ ہو کالی، تیں ایک پیار کر کے دل بھر کے او بھلا دینا جانے تے بھاویں نہ جانے ہو میڈا ڈھول ہوا اینہاں ٹانگی

وہ تنور کے اوپر رکھے ہوئے صندوق پر گم سم بیٹھا سن رہا تھا۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ وہ اپنے کمرے کی روشنی بھی بجھا کر آیا تھا لیکن گیت کے سحر انگیز الفاظ اس کے سامنے جیسے ایک سکرین پر چلتے ہوئے فلم پیش کر رہے تھے۔ برسات کی راتوں میں کوٹھی کی منڈیر پر اپنے محبوب کا انتظار کرتی ہوئی حسینہ! وہ کب لوٹے گا؟ کاش کہ اس کا محبوب اسے اس کب تک انتظار کھینچے گا۔ میڈا ماہی ٹوں ماہیا میڈا ڈھولا ہو ہوے۔ میڈا اکلاپا دل اداس ہوئے ڈھول جانی۔

ڈھولک کی آواز تیز ہو گئی۔ تال بدل گیا۔ گھنگھروؤں کے چھناکے اور عورتوں کے قہقہے بلند ہو گئے اور ایک نئی آواز اور ایک نیا گیت فضا میں گونجنے لگا۔ تیڈی ماں تاں میٹھی ماسی ہے چیکے ادب نہ ڈاسی

دکھڑی تھیندی بال ڈھول جانی ساڈی گلی آویں تیڈی مہربانی

قہقہوں کے طوفان کے درمیان تالیوں کا شور بھی سنائی دیا۔ تالیاں جو ایک خاص لے پر بجائی جا رہی تھیں اور اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اپنے علاقے کے گیت سن کر، خوشی اور جوش سے! ۔ اس مرتبہ ایک نئی آواز گونجی! ساڈی کنڈھا تے ٹر ویلیاں، تیڈی ماں ماں من سہیلیاں ڈو اکھیاں گھر پیا ہم ڈھول جانی، ساڈی گلی آویں تیڈی مہربانی ہر بار آواز مختلف تھی۔ ہر بول نیا تھا۔ طنز، مزاح اور حقیقت سے بھرپور۔ زندگی کی ساری سچائیاں ان سادے لفظوں ان بولوں میں بھری ہوئی تھیں۔ ناچ، گانے اور قہقہوں کے ذریعے ایک دوسرے کو کوسا جا رہا تھا۔ گلے اور شکایتیں کی جا رہی تھیں۔ یہ مقصد کسی دوسرے ذریعے حاصل کرنا مشکل تھا۔ یہ صرف گیتوں کی مدد سے ہو سکتا تھا۔ گیت جو ایک قوم کی خاصیت تھے، گیت جو ایک قوم کا مزاج تھے۔ ایک خاص علاقے کی صدیوں کی روایات، تہذیب و تمدن کے حامل تھے۔ سینکڑوں میل لمبے فاصلے اور دشوار گزار منزلوں کی صعوبتیں برداشت کر کے یہ گیت سینوں کے اندر محفوظ کر کے یہاں تک لائے گئے تھے۔ کتنے بھائی، کتنی بہنیں، کتنے بچے گو کہ بھی اس خزانے کو لٹنے سے بچا لیا گیا تھا۔ آج ڈیرہ [illegible] سے بہت دور، لودھراں تک پہنچنے کا

تصوّر نہیں ہے۔ لیکن ان کی یاد، ان کا حسن، انکی مستی اور گرمی سینے کے اندر محفوظ ہے۔ نئی نسل کے لڑکے لڑکیاں حیران تھے۔ وہ اس زبان کے جس میں گیت کہے گئے تھے، محاوروں اور چٹخاروں سے آشنا نہیں تھے۔ محبت، سادگی اور خلوص اور حسن سے مالا مال زبان کا محافظ کون بنے گا؟ حالات نے انھیں نئی سرزمین پر پیدا کیا۔ بولنے اور سمجھنے کے لئے نئی زبان دے دی۔ ان کے آباؤ اجداد کا اتنا بڑا سرمایہ ان کے ماں باپ کے ساتھ ختم ہو جائے گا۔ بیس سے پچاس برس تک کی عورتوں کی یہ مختصر سی ٹولی پھر یہ گیت نہیں گائے گی۔ یہ سُر خاموش ہو جائیں گے۔ یہ تال ٹوٹ جائیں گے۔ یہ چراغ بجھ جائیں گے۔ ایک ایک کر کے سارے چراغ!

سائیں داس کے کانوں میں اچانک اپنی بیوی کی آواز آئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہو گیا۔ بالکل بے اختیار سا ہو کر دیوار سے سر نکال کر اس بات کی پروا کئے بغیر کہ اس کے چہرے پر روشنی پڑ رہی تھی۔ اس نے عورتوں کے ہجوم میں اپنی بیوی کو ڈھونڈا اور حیران رہ گیا۔ وہ باقی عورتوں کی طرح سر کے اوپر پگڑی کے انداز میں دوپٹہ باندھے جوڑوں کا درد بھول کر ناچ رہی تھی گا رہی تھی۔

میں اتھے تے ماہی بیندا واں لے
نکل آویں بدلاں دی چھاں تے
رُت گرمی دی ــــ ڈھل جانی
ساڈی گلی آویں تیندی مہربانی

اس نے دونوں بازو دیوار کے اوپر ٹیک دیئے۔ اس کا جی چاہا بیوی کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ایک بول وہ بھی گائے۔ عورتوں کا لوک ناچ دیکھنے کے لئے بہت سارے لوگ صحن میں جمع ہو گئے تھے۔ دفعتاً اس کے بازو کو کسی نے چھوا اور دوسرے ہی لمحہ اس نے اپنے سامنے دیوار کی اس طرف ٹھاکر داس کو کسی چیز کے سہارے ابھرتے ہوئے دیکھا۔

ٹھاکر داس اسے دیکھ کر زور سے ہنس پڑا اور بولا۔ "آؤ نا یار ادھر آ جاؤ۔ بڑا لطف آ رہا ہے۔"

سائیں داس نے ایک لمحہ کے لئے توقف کیا۔ ٹھاکر داس کو گھورا، اس کی آنکھوں میں جھلکتے ہوئے خلوص کو پرکھا جسے اپنے علاقے کے جذبات بھرے لوک گیت اور لوک ناچ اس کے دل کی انتہائی گہرائیوں میں سے کھنگال کر اس کی آنکھوں میں لے آئے تھے۔ سائیں داس مسکرا دیا اور بازوؤں پر بدن کا سارا بوجھ ڈال کر بدن کو اوپر اٹھایا اور اُچک کر دیوار پر چڑھ گیا۔ ٹھاکر داس کے کندھے پر اپنا بازو پھیلا دیا اور بے اختیار لہک لہک کر گانے لگ گیا،

چھلا پاتی کھرڑی میں ڈوں
نمبردار وڈی واتوں!
دسّں ڈے عزیاں نوں
وے بلا تھمنا!
چھلا ڈوری رکھنا!

یہ دیکھا تو ٹھاکر داس نے ہنستے ہوئے، سائیں داس کو اپنے بوڑھے مگر مضبوط بازوؤں پر اٹھا کر دیوار سے اپنی طرف اُتار لیا۔

بو شاید بدحواسی میں مدن کی بجائے دُلہن کا منہ چومنے چلے تھے۔ گھر میں بوڑھا باپ رہ گیا تھا اور چھوٹے بہن بھائی۔ چھوٹی دلاری تو ہر وقت بھابی کی بغل میں گھُسی رہتی۔ گلی محلے کی کوئی عورت دلہن کو دیکھے یا نہ دیکھے، دیکھے تو کتنی دیر تک دیکھے یہ سب اس کے اختیار میں تھا۔ آخر یہ سب ختم ہوا اور اندو آہستہ آہستہ پرانی ہونے لگی۔ لیکن کالکاجی کی اس نئی آبادی کے لوگ اب بھی آتے جاتے مدن کے ساتھ رُک جاتے اور کسی بھی بہانے سے اندر چلے آتے۔ اندو انھیں دیکھتے ہی ایک دم گھونگھٹ کھینچ لیتی لیکن اس چھوٹے سے وقفے میں انھیں جو کچھ دکھائی دے جاتا وہ بنا گھونگھٹ کے دکھائی ہی نہ دے سکتا تھا۔ مدن کا کاروبار گندے بروزے کا تھا۔ کہیں بڑی سپلائی والے دو تین جنگلوں میں چیڑ اور دیودار کے پیڑوں کو جنگل کی آگ نے آلیا تھا اور وہ دھڑ دھڑ جلتے ہوئے خاک سیاہ ہو کر رہ گئے تھے۔ میسور اور آسام کی طرف سے منگوایا ہوا بروزہ مہنگا پڑتا تھا اور لوگ اسے مہنگے داموں خریدنے کو تیار نہ تھے۔ ایک تو آمدنی کم ہو گئی تھی اس پر مدن جلدی ہی دکان اور اس کے ساتھ والا دفتر بند کر کے گھر چلا آتا۔ گھر پہنچ کر اس کی ساری کوشش یہی ہوتی کہ سب کھائیں پئیں اور اپنے اپنے بستروں میں دبک جائیں۔ جبھی وہ کھاتے وقت خود تھالیاں اُٹھا اُٹھا کر باپ اور بہن کے سامنے رکھتا اور ان کے کھا چکنے کے بعد جھوٹے برتنوں کو سمیٹ کر نل کے نیچے رکھ دیتا۔ سب سمجھتے تھے۔ بھابی نے مدن کے کان میں کچھ پھونکا ہے اور اب وہ گھر کے کام کاج میں دلچسپی لینے لگا ہے۔ مدن سب سے بڑا تھا، کندن اس سے چھوٹا اور پاشی سب سے چھوٹا تھا جب کندن بھابی کے سواگت میں سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانے پر اصرار کرتا تو باپ دھنی رام وہیں ڈانٹ دیتا۔

"کھاؤ تم"۔ وہ کہتا۔ "وہ بھی کھا لیں گے"۔ اور پھر رسوئی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا اور جب بہو کھانے پینے سے فارغ ہو جاتی اور برتنوں کی طرف متوجہ ہوتی تو بابو دھنی رام اسے روکتے ہوئے کہتے "رہنے دو بہو برتن صبح ہو جائیں گے"۔

اندو کہتی "نہیں بابو جی — میں ابھی کیے دیتی ہوں جھپاکے سے"۔

تب بابو دھنی رام ایک لرزتی ہوئی آواز میں کہتے "مدن کی ماں ہوتی بہو، تو یہ سب تمھیں کرنے دیتی ...... اور اندو ایک دم اپنے ہاتھ روک لیتی۔

چھوٹا پاشی بھابی سے شرماتا تھا اس خیال سے کہ دلہن کی گود جھٹ سے ہری ہو، بیکلی بھابی اور دریاباد والی پھوپھی نے ایک رسم میں پاشی ہی کو اندو کی گود میں ڈالا تھا، جب سے اندو اسے

نہ صرف دیور بلکہ اپنا بچہ سمجھنے لگی تھی۔ جب بھی وہ پیار سے پاشی کو بانہوں میں لینے کی کوشش کرتی تو وہ گھبرا اُٹھتا اور اپنا آپ چھڑا کر دو ہاتھ کی دوری پر کھڑا ہو جاتا۔ دیکھتا اور ہنستا رہتا۔ پاس آتا نہ دور ہٹتا۔ ایک عجیب اتفاق سے، ایسے میں بابوجی ہمیشہ وہیں موجود ہوتے اور پاشی کو ڈانٹتے ہوئے کہتے "ارے جانا — بھابی پیار کرتی ہے، ابھی سے مرد ہو گیا ہے تو؟"....

اور دلاری تو پیچھا ہی نہ چھوڑتی۔ اس کے "میں تو بھابی کے ساتھ ہی سووں گی" اصرار نے بابوجی کے اندر کوئی جنادھن جگا دیا تھا۔ ایک رات اسی بات پہ دلاری کو زور سے چپت پڑی اور وہ گھر کی کچی آدھی پکی نالی میں جا گری۔ اندو نے لپکتے ہوئے پکڑا تو سر پر سے دوپٹہ اُڑ گیا۔ بالوں کے پھول اور چڑیاں، مانگ کا سیندور، کانوں کے کرن پھول سب ننگے ہو گئے۔ "بابوجی!" اندو نے سانس کھینچتے ہوئے کہا..... ایک ساتھ دلاری کو پکڑنے اور سر پہ دوپٹہ اوڑھنے میں اندو کے پسینے چھوٹ گئے۔ اس بے ماں کی بچی کو چھاتی کے ساتھ لگائے ہوئے اندو نے اسے ایک ایسے بستر پہ سلا دیا جہاں پلنے ہی سرہانے، تکیے ہی تکیے تھے۔ نہ کہیں پائنتی تھی نہ کاٹھ کے بازو، چوٹ تو ایک طرف کہیں کوئی چبھنے والی چیز بھی نہ تھی۔ پھر اندو کی انگلیاں دلاری کے پھوڑے ایسے سر پہ چلتی ہوئی اسے دُکھا بھی رہی تھیں اور مزا بھی دے رہی تھیں۔ دُلاری کے گالوں پر بڑے بڑے اور پیارے پیارے گڑھے پڑتے تھے۔ اندو نے ان گڑھوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "ہائے، ری منی! تیری ساس مرے۔ کیسے گڑھے پڑ رہے ہیں گالوں پہ۔" منی نے منی کی طرح کہا "یہ گڑھے تمہارے بھی تو پڑتے ہیں بھابی۔"

"ہاں منو!" اندو نے کہا اور ایک ٹھنڈا سانس لیا۔

مدن کو کسی بات پہ غصہ تھا وہ پاس ہی کھڑا سب کچھ سُن رہا تھا، بولا "میں تو کہتا ہوں ایک طرح سے اچھا ہی ہے۔"

"کیوں اچھا کیوں ہے؟" اندو نے پوچھا۔ "ہاں — نہ اُگے بانس نہ بجے بانسری... ساس نہ ہو تو کوئی جھگڑا ہی نہیں رہتا۔"

اندو نے ایکا ایکی خفا ہوتے ہوئے کہا "تم جاؤ جی، سو رہو جا کے ... بڑے آئے ہو ..... آدمی جیتا ہے تو لڑتا ہے نا؟ مرگھٹ کی چُپ چاپ سے جھگڑے بھلے۔ جاؤ نا،

رسوئی میں تمہارا کیا کام ؟"

مدن کھسیانہ ہو کر رہ گیا۔ بابو دھنی رام کی کھاٹ سے باقی بچے تو پہلے ہی سے اپنے اپنے بستروں میں یوں جا پڑے تھے جیسے دفتر میں چھٹیاں سارٹ ہوتی ہیں۔ لیکن مدن وہیں کھڑا رہا۔ احتیاج نے اسے ڈھیٹ اور بے شرم بنا دیا تھا لیکن اس وقت جب اندو نے بھی اسے ڈانٹ دیا تو وہ روہانسا ہو کر اندر چلا گیا۔ دیر تک مدن بستر میں پڑا کسمساتا رہا۔ لیکن بابو جی کے خیال سے اندو کو آواز دینے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس کی بے صبری کی حد ہو گئی۔ جب منی کو سلانے کے لئے اندو کی لوریاں سنائی دیں: "تو آنند یادرائی' بورائی' ستائی"۔

وہی لوری جو دلاری منی کو سلا رہی تھی، مدن کی نیند بھگا رہی تھی۔ اپنے آپ سے بیزار ہو کر اس نے زور سے چادر سر پر کھینچ لی سفید چادر کے سر پہ لپیٹنے اور سانس کے بند کرنے سے خواہ مخواہ ایک مردے کا تصور پیدا ہو گیا۔ مدن کو یوں لگا جیسے وہ مر چکا ہے اور اس کی دلہن اندو اس کے پاس بیٹھی زور زور سے سر پیٹ رہی ہے' دیوار کے ساتھ کلائیاں مار مار کر چوڑیاں توڑ رہی ہے اور پھر گرتی پڑتی روتی چلاتی رسوئی میں جاتی ہے اور چولھے کی راکھ سر پر ڈال لیتی ہے پھر باہر لپک جاتی ہے اور بانہیں اٹھا اٹھا کر گلی محلے کے لوگوں سے فریاد کرتی ہے۔ "لوگو! میں لٹ گئی"۔ اب اسے دوپٹے کی پروا نہیں' قمیص کی پروا نہیں' مانگ کا سیندور' بالوں کے پھول اور چڑیاں' جذبات اور خیالات کے طوطے تک اڑ چکے ہیں ـــــ

مدن کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہہ رہے تھے حالانکہ رسوئی میں ہنس رہی تھی۔ پل بھر میں اپنے سہاگ کے اجڑنے اور پھر بس جانے سے بے خبر۔ مدن جب حقائق کی دنیا میں آیا تو آنسو پونچھتے ہوئے اپنے اس رونے پر ہنسنے لگا۔۔۔۔ ادھر اندو ہنس تو رہی تھی لیکن اس کی ہنسی دبی دبی تھی۔ بابو جی کے خیال سے وہ کبھی اونچی آواز میں نہ ہنستی تھی' جیسے کھلکھلاہٹ کوئی ننگا پن ہے' خاموشی دوپٹہ اور دبی دبی ہنسی ایک گھونگھٹ۔ پھر مدن نے اندو کا ایک خیالی بت بنایا اور اس سے بیسیوں باتیں کر ڈالیں یوں اس سے پیار کیا جیسے ابھی تک نہ کیا تھا۔۔۔ وہ پھر اپنی دنیا میں لوٹا جس میں پاس کا بستر خالی تھا۔ اس نے ہولے سے آواز دی ـــــ اندو ـــــ اور پھر چپ ہو گیا۔ اس ادھیڑ بن میں وہ بورائی ستائی نندیا اس سے بھی لپٹ گئی ـــــ ایک اونگھ سی آئی

لیکن ساتھ ہی یوں لگا جیسے شادی کی رات والی پڑوسی مسطےّ کی بھینس منہ کے پاس پھنکارنے لگی ہو۔ وہ ایک بے کلی کے عالم میں اُٹھا، پھر رسوئی کی طرف دیکھتے، سر کو کھجاتے دو تین جمائیاں لیکر لیٹ گیا۔ سو گیا۔

مدن جیسے کانوں کو کوئی سندیسہ دیکھ رہا تھا۔ جب اندو کی چوڑیاں بستر کی سلوٹیں سیدھی کرنے کے لئے کھنک اٹھیں تو وہ بھی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ یوں ایکدم جاگنے میں محبت کا جذبہ اور بھی تیز ہو گیا تھا۔ پیار کی کروٹوں کو توڑے بغیر آدمی سو جائے اور ایکا ایکی اُٹھے تو محبت قسم توڑ دیتی ہے۔

مدن کا سارا بدن اندر کی آگ سے پھُنک رہا تھا اور یہی اس کے غصے کا کارن بن گیا جب اس نے کچھ بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔ "سو تم ۔۔۔ آگئیں؟"

"ہاں!"

"منی ۔۔۔ سو گئی؟"

اندو جھجکی جھجکی ایکدم سیدھی کھڑی ہو گئی۔ "ہائے رام"۔ اس نے ناک پر انگلی رکھتے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "کیا کہہ رہے ہو ۔۔۔ ارے کیوں بے چاری۔ ماں باپ کی ایک ہی بیٹی۔"

"ہاں ۔۔۔" مدن نے کہا "بھابی کی ایک ہی نند"۔ اور پھر ایکدم تحکمانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا "زیادہ منہ مت لگاؤ اس چڑیل کو۔"

"کیوں اس میں کیا پاپ ہے؟"

"یہی پاپ ہے"۔ مدن نے اور چڑتے ہوئے کہا۔ "وہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتی تمہارا۔ جب دیکھو جونک کی طرح چمٹی ہوئی ہے۔ دفان ہی نہیں ہوتی۔"

"ہا ۔۔۔" اندو نے مدن کی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "بہنوں اور بیٹیوں کو یوں تو دھتکارنا نہیں چاہیے۔ بے چاری دو دن کی مہمان۔ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں، ایک دن چل ہی دے گی"۔ اس کے بعد اندو کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن وہ چپ ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے ماں باپ، بھائی بہن، چچا تاؤ سبھی گھوم گئے۔ کبھی وہ بھی ان کی دلاری تھی جو پلک جھپکتے ہی نیاری ہو گئی۔ اور پھر دن رات اس کے نکالے جانے کی باتیں ہونے لگیں جیسے گھر میں کوئی بڑی سی بانبی ہے جس میں کوئی ناگن رہتی ہے اور جب تک وہ پکڑ کر پھینکوائی نہیں جاتی گھر کے لوگ آرام کی نیند سو نہیں سکتے۔ دور دور سے کیلنے والے، نتھ کرنے والے، دانت بھوڑنے والے مانتری بلائے گئے۔ بڑے بڑے دھنونتری اور موتی ساگر ۔۔۔ آخر ایک دن اُتر پچھم کی

طرف سے لال آندھی آئی جو صاف ہوئی تو ایک لاری کھڑی تھی جس میں گوٹے کناری لپٹی ہوئی ایک دلہن سمٹی تھی پیچھے گھر میں ایک سر بجتی ہوئی شہنائی بین کی آواز معلوم ہو رہی تھی۔ پھر ایک دھچکے کے ساتھ لاری چل دی۔ . . .

مدن نے کچھ برافروختگی کے عالم میں کہا ـــ "تم عورتیں بڑی چالاک ہوتی ہو۔ ابھی کل ہی اس گھر میں آئی ہو اور یہاں کے سب لوگ تمھیں ہم سے زیادہ پیارے لگنے لگے ہیں"۔

"ہاں!" اندو نے اثبات سے کہا۔

"یہ سب جھوٹ ہے . . . یہ ہو ہی نہیں سکتا"۔

"تمہارا مطلب ہے میں ـــ"

"دکھاوا ہے یہ سب ـــ ہاں!"

"اچھاجی؟" اندو نے آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے کہا۔ "یہ سب دکھاوا ہے میرا؟" اور اندو اٹھ کر اپنے بستر پر چلی گئی اور سر تکیے میں منہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔ مدن اسے منانے ہی والا تھا کہ اندو خود ہی اٹھ کر مدن کے پاس آ گئی اور سختی سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی "تم جو ہر وقت جلی کٹی کہتے رہتے ہو ـــ ہوا کیا ہے تمھیں؟" شوہرانہ رعب داب کے لئے مدن کے ہاتھ بہانہ آگیا۔ "جاؤ جاؤ ـــ سو جاؤ جا کے" مدن نے کہا۔ "مجھے تم سے کچھ نہیں لینا"۔

"تمھیں کچھ نہیں لینا، مجھے تو لینا ہے"۔ اندو بولی۔ "زندگی بھر لینا ہے"۔ اور وہ چھینا جھپٹی کرنے لگی۔ مدن اسے دھتکارتا تھا اور وہ اس سے لپٹ لپٹ جاتی تھی۔ وہ اس مچھلی کی طرح تھی جو بہاؤ میں بہہ جانے کی بجائے آبشار کے تیز دھارے کو کاٹتی ہوئی اوپر ہی اوپر پہنچا چاہتی ہو۔ چٹکیاں لیتی، ہاتھ پکڑتی، روتی ہنستی وہ کہہ رہی تھی ـــ

"پھر مجھے پھاپھا کٹنی کہو گے؟"

"وہ تو . . . سبھی عورتیں ہوتی ہیں"۔

"ٹھہرو ـــ تمہاری تو ـــ" یوں معلوم ہوا جیسے اندو کوئی گالی دینے والی ہو۔ اور اس نے منہ میں کچھ منمنایا بھی۔ مدن نے مڑتے ہوئے کہا۔ "کیا کہا؟" اور اندو نے اب کے سنائی دینے والی آواز میں دہرا دیا۔ مدن کھلکھلا کر ہنس پڑا ـــ اگلے ہی لمحے میں اندو مدن کے بازوؤں میں تھی اور کہہ رہی تھی۔ "تم مرد لوگ کیا جانو؟ ـــ جس سے پیار ہوتا ہے اس کے

سبھی عزیز پیارے معلوم ہوتے ہیں کیا باپ کیا بھائی اور کیا بہن ۔" اور پھر ایکا ایکی کہیں دور دیکھتے ہوئے بولی ۔ "میں تو دلاری منی کا بیاہ کروں گی۔"

"حد ہو گئی۔" مدن نے کہا۔ "ابھی ایک ہاتھ کی ہوئی نہیں اور بیاہ کی بھی سوچنے لگیں۔"

"تمھیں ایک ہاتھ کی دکھتی ہے نا؟" اندو بولی اور پھر اپنے دونوں ہاتھ مدن کی آنکھوں پر رکھتی ہوئی کہنے لگی۔ "ذرا آنکھیں بند کرو اور پھر کھولو۔" مدن نے سچ مچ ہی آنکھیں بند کر لیں اور جب کچھ دیر تک نہ کھولیں تو اندو بولی۔ "اب کھولو بھی ۔۔۔۔ اتنی دیر میں تو میں بوڑھی ہو جاؤں گی۔" تبھی مدن نے آنکھیں کھول لیں۔ لمحہ بھر کے لیے اسے یوں لگا جیسے سامنے اندو نہیں منی بیٹھی ہے، اور وہ کھو سا گیا۔

"میں نے تو ابھی سے چار سوٹ اور کچھ برتن الگ کر ڈالے ہیں اس کے لیے۔" اندو نے کہا اور جب مدن نے کوئی جواب نہ دیا تو اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔ "تم کیوں پریشان ہوتے ہو ۔۔۔ یاد نہیں لیا تھا وچن؟ تم اپنے دکھ مجھے دے چکے ہو۔"

"ایں؟" مدن نے چونکتے ہوئے کہا اور جیسے بے فکر سا ہو گیا۔ لیکن اب کے جب اس نے اندو کو اپنے ساتھ لپٹایا تو وہاں ایک جسم ہی نہیں رہ گیا تھا، ساتھ ایک روح بھی شامل ہو گئی تھی ۔۔۔۔

مدن کے لیے اندو روح ہی روح تھی۔ اندو کے جسم بھی تھا لیکن وہ ہمیشہ کسی نہ کسی وجہ سے مدن کی نظروں سے اوجھل ہی رہا۔ ایک پردہ تھا، خواب کے تاروں سے بنا ہوا، آہوں کے دھوئیں سے رنگین، قہقہوں کی زرتاری سے چکاچوند، جو ہر وقت اندو کو ڈھانپے رہتا تھا۔ مدن کی نگاہوں اور اس کے ہاتھوں کے دُشاسن صدیوں سے اس دروپدی کا چیر ہرن کرتے چلے آئے تھے جو کہ عرفِ عام میں بیوی کہلاتی ہے لیکن ہمیشہ اسے آسمانوں سے تھانوں کے تھان، گزوں کے گز کپڑا ننگاپن ڈھانپنے کے لیے ملتا آیا تھا۔ دُشاسن تھک ہار کے یہاں وہاں گرے پڑے تھے لیکن دروپدی وہیں کھڑی تھی، عزت اور پاکیزگی کی سفید اور بے داغ ساڑی میں ملبوس۔ وہ دیوی لگ رہی تھی اور ــــ

مدن کے لوٹتے ہوئے ہاتھ خجالت کے پسینے سے تر ہوتے جیسے سکھانے کے لیے وہ انھیں اوپر ہوا میں اٹھا دیتا اور پھر ہاتھ کے پنجوں کو پورے طور پر پھیلاتا ہوا، ایک تشنجی کیفیت میں اپنی آنکھوں کی پھیلتی پھٹتی ہوئی پتلیوں کے سامنے رکھ دیتا۔ اور پھر انگلیوں کے بیچ میں سے جھانکتا۔ اندو کا مرمریں جسم، خوش رنگ اور گداز سامنے پڑا ہوتا۔ استعمال کے لیے پاس، ابتذال کے لیے دور ۔۔۔۔

(جملہ حقوق بحق مرتب محفوظ)

مرتب کی دوسری زیر ترتیب کتابیں:-

۱- اُردو شاعری میں زیورات
۲- مضامین پنج مع لطائف و منظومات

اشاعت اوّل — اکتوبر سنہ ۱۹۶۰ء
تعداد — ایک ہزار
قیمت — ۲ روپے ۲۵ نئے پیسے

مطبوعہ
مُسلم ایجوکیشنل پریس - علی گڑھ

کبھی جب اندو کی ناک ہندی ہو جاتی تو اسی قسم کے فقرے ہوتے۔

"ہائے جی، گھر میں چھوٹے بڑے سبھی ہیں۔ وہ کیا کہیں گے؟"

مدن کہتا۔ "چھوٹے سمجھتے نہیں —— بڑے انجان بن جاتے ہیں۔"

اسی دوران میں بابو دھنی رام کی تبدیلی سہارنپور ہوگئی۔ وہاں وہ ریلوے میل سروس میں سلیکشن گریڈ کے ہیڈ کلرک ہو گئے۔ اتنا بڑا کوارٹر ملا کہ اس میں آٹھ کنبے رہ سکتے تھے لیکن بابو دھنی رام اس میں اکیلے ہی ٹانگیں پھیلائے پڑے رہتے۔ زندگی بھر وہ بال بچوں سے کبھی علیحدہ نہیں ہوئے تھے۔ سخت گھریلو قسم کے آدمی، آخری زندگی میں اس تنہائی نے ان کے دل میں وحشت پیدا کر دی لیکن مجبوری تھی، بچے سب دلی میں مدن اور اندو کے پاس تھے اور وہیں اسکولوں میں پڑھتے تھے۔ سال کے خاتمے سے پہلے انھیں بیچ میں سے اٹھانا ان کی پڑھائی کے لئے اچھا نہ تھا۔ بابوجی کو دل کے دورے پڑنے لگے۔

بارے گرمی کی چھٹیاں ہوئیں اور ان کے بار بار لکھنے پر مدن نے اندو کو کندن، پاشی اور دلاری کے ساتھ سہارنپور بھیج دیا —— دھنی رام کی دنیا چہک اٹھی۔ کہاں انھیں دفتر کے کام کے بعد فرصت ہی فرصت تھی اور کہاں اب کام ہی کام تھا۔ بچے، بچوں ہی کی طرح جہاں کپڑے اتارتے وہیں پڑے رہنے دیتے اور بابوجی انھیں سمیٹتے پھرتے۔ اپنے مدن سے دور، السائی ہوئی رتی، اندو تو اپنے پہناوے تک سے غافل ہو گئی تھی۔ اور رسوئی میں یوں پھرتی تھی جیسے کانجی ہاؤس میں گائے، باہر کی طرف منہ اٹھا اٹھا کر اپنے مالک کو ڈھونڈا کرتی ہے۔ کام دام کرنے کے بعد وہ کبھی اندر ٹرنکوں پر لیٹ جاتی، کبھی باہر کنیر کے بوٹے کے پاس اور کبھی آم کے پیڑ تلے، جو آنگن میں کھڑا سینکڑوں ہزاروں دلوں کو تھامے ہوئے تھا۔

ساون بھادوں میں ڈھلنے لگا۔ آنگن میں سے باہر کا دریچہ کھلتا تو کنواریاں، نئی بیاہی ہوئی لڑکیاں پینگ بڑھاتے ہوئے گاتیں —— جھولا کن نے ڈالو رے اَمریاں —— اور پھر گیت کے بول کے مطابق وہ جھولتیں اور جھلاتیں اور کہیں چار مل جاتیں تو بھول بھلیاں ہو جاتیں۔ ادھیڑ عمر کی، بوڑھی عورتیں ایک طرف کھڑی تکا کرتیں۔ اندو کو معلوم ہوتا جیسے وہ بھی ان میں شامل ہو گئی ہے۔ تبھی وہ منہ پھیر لیتی اور ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہوئی سو جاتی۔ بابوجی پاس سے گزرتے تو اسے جگانے، اٹھانے کی ذرا بھی کوشش نہ کرتے بلکہ موقعہ پا کر اس شلوار کو جو بہو دھوتی

سے بدل آتی اور جسے وہ ہمیشہ اپنی ساس والے پرانے صندل کے صندوق پر پھینک دیتی، اٹھا کر کھونٹی پر ٹکا دیتے۔ ایسے میں انھیں سب سے نظریں بچانا پڑتیں۔ لیکن ابھی شلوار کو سمیٹ کر مڑتے ہی تو نیچے گر کرنے میں نگاہ بہو کے محرم پر جا پڑتی۔ تب ان کی ہمت جواب دے جاتی اور وہ لپک جھپک کمرے سے نکل بھاگتے جیسے سانپ کا بچہ بل سے باہر آگیا ہو۔ پھر برآمدے میں ان کی آواز سنائی دینے لگتی —— ادم نمو بھگوتے واسو دیوا ——

اڑوس پڑوس کی عورتوں نے باوجی کی بہو کی خوبصورتی کی داستانیں دور دور تک پہنچا دی تھیں۔ جب کوئی عورت باوجی کے سامنے بہو کے پیارے پن اور سڈول جسم کی بات کرتی تو وہ خوشی سے پھول جاتے اور کہتے: "ہم تو دھنیہ ہو گئے، امی چند کی ماں! شکر ہے ہمارے گھر میں بھی کوئی صحت والا جیو آیا۔" اور یہ کہتے ہوئے ان کی نگاہیں کہیں دور پہنچ جاتیں جہاں دق کے عارضے تھے، دوائی کی شیشیاں، اسپتال کی سیڑھیاں یا چیونٹیوں کے بل۔ نگاہ قریب آتی تو انھیں موٹے موٹے گدرائے ہوئے جسم والے کئی بچے بغل میں، جانگھ پر، گردن پر چڑھتے اترتے ہوئے محسوس ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا جیسے ابھی اور آ رہے ہیں۔ پہلو پر لیٹی ہوئی بہو کی کمر زمین کے ساتھ اور کولھے چھت کے ساتھ لگ رہے ہیں اور وہ دھڑا دھڑ بچے جنتی جا رہی ہے اور ان بچوں کی عمر میں کوئی فرق نہیں۔ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا، سبھی ایک سے۔ جڑواں —— توام ..... ادم نمو بھگوتے ——

آس پاس کے لوگ سب جان گئے تھے اندو باوجی کی چہیتی بہو ہے۔ چنانچہ دودھ اور چھاچھ کے مٹکے دھنی رام کے گھر آنے لگے اور پھر ایک دم سلام دین گوجر نے فرمائش کر دی۔ اندو سے کہا: "بی بی! میرا بیٹا آر۔ ایم۔ ایس میں قلی رکھوا دو، اللہ تم کو دا جھر دیگا۔" اندو کے اشارے کی دیر تھی کہ سلام دین کا بیٹا نوکر ہو گیا۔ وہ بھی سارٹر بھی نہ ہو سکا، اس کی قسمت، آسامیاں ہی زیادہ نہ تھیں۔ بہو کے کھانے پینے اور اس کی صحت کا باوجی خاص خیال رکھتے تھے۔ دودھ پینے سے اندو کو چڑ تھی۔ وہ رات کے وقت خود دودھ کو ہانڈی میں پھینٹ گلاس میں ڈال، بہو کو پلانے کے لیے اس کی کھٹیا کے پاس آ جاتے۔ اندو اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے اٹھتی اور کہتی: "نہیں باوجی مجھ سے نہیں پیا جاتا۔"

"تیرا تو سسر بھی پیے گا۔" وہ مذاق سے کہتے۔

"تو پھر آپ پی لیجئے نا۔" اندو ہنستی ہوئی جواب دیتی اور بابوجی ایک مصنوعی غصے سے برس پڑتے۔
"تو چاہتی ہے بعد میں تیری بھی وہی حالت ہو جو تیری ساس کی ہوئی؟"

"ہوں — ہوں —" اندو لاڈ سے روٹھنے لگتی۔ آخر کیوں نہ روٹھتی۔ وہ لوگ ہیں روٹھتے جنھیں منانے والا کوئی نہ ہو۔ لیکن یہاں تو منانے والے سب تھے، روٹھنے والا صرف ایک۔ جب اندو بابوجی کے ہاتھ سے گلاس نہ لیتی تو وہ اسے کھٹیا کے پاس سرہانے کے نیچے رکھ دیتے — "اور لے یہ پڑا ہے — تیری مرضی ہے پی — نہیں مرضی تو نہ پی —" کہتے ہوئے چل دیتے۔ اپنے بستر پہ پہنچ کر دھنی رام دلاری منی کے ساتھ کھیلنے لگتے۔ دلاری کی بابوجی کے ننگے پنڈے کے ساتھ پنڈا گھسانے اور پھر پیٹ پر منہ رکھ کر پھٹکڑا پھلانے کی عادت تھی۔ آج جب بابوجی اور منی یہ کھیل کھیل رہے تھے، ہنس ہنسا رہے تھے تو منی نے بھابی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "دودھ تو کھراب ہو جائے گا بوجی۔ بھابی تو پیتی ہی نہیں۔"

"پیے گی، ضرور پیے گی بیٹا۔" بابوجی نے دوسرے ہاتھ سے پاشی کو لپٹاتے ہوئے کہا۔ "عورتیں گھر کی کسی چیز کو خراب ہوتے نہیں دیکھ سکتیں۔"

ابھی یہ فقرہ بابوجی کے منہ ہی میں تھا کہ ایک طرف سے "ہُش — ہے خصم کھانی" کی آواز آنے لگتی۔ پتہ چلتا بہو بلّی کو بھگا رہی ہے اور پھر کوئی غٹ غٹ سی سنائی دیتی اور سب جان لیتے بہو — بھابی نے دودھ پی لیا۔ کچھ دیر کے بعد کندن بابوجی کے پاس آتا اور کہتا۔ "بوجی بھابی رو رہی ہے۔"

"ہائیں؟" بابوجی کہتے اور پھر اٹھ کر اندھیرے میں دور اسی طرف دیکھنے لگتے جدھر بہو کی چارپائی پڑی ہوتی۔ کچھ دیر یونہی بیٹھے رہنے کے بعد وہ پھر لیٹ جاتے اور کچھ سمجھتے ہوئے کندن بیٹے کہتے۔ "جا — تو سو جا — وہ بھی سو جائے گی اپنے آپ۔" اور پھر سے لیٹتے ہوئے بابو دھنی رام آسمان پر کھلے ہوئے پرماتما کے گلزار کو دیکھنے لگتے، اور اپنے من کے بھگوان سے پوچھتے۔

"چاندی کے ان کھلتے بند ہوتے ہوئے پھولوں میں میرا پھول کہاں ہے؟" اور پھر پورا آسمان انھیں درد کا ایک دریا دکھائی دینے لگتا اور کانوں میں ایک مسلسل ہاؤ ہو کی آواز سنائی دیتی جسے سنتے ہوئے وہ کہتے: "جب سے دنیا بنی ہے انسان کتنا رویا ہے!" — اور وہ روتے روتے سو جاتے۔

اندو کے جانے کے بیس پچیس روز ہی میں مدن نے واویلا شروع کر دیا۔ اس نے لکھا۔ میں بازار کی روٹیاں کھاتے کھاتے تنگ آگیا ہوں۔ مجھے قبض ہو گئی ہے، گردے کا درد شروع ہو گیا ہے۔ پھر جیسے دفتر کے لوگ چھٹی کی عرضی کے ساتھ ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ بھیج دیتے ہیں، مدن نے بابو جی کے ایک دوست سے تصدیق کی چٹھی لکھوا بھیجی۔ اس پر بھی جب کچھ نہ ہوا تو ایک ڈبل تار۔ جوابی ــــ جوابی تار کے پیسے مارے گئے لیکن بلا سے۔ اندو اور بچے لوٹ آئے تھے۔ مدن نے اندو سے دو دن سیدھے منہ بات ہی نہ کی۔ یہ دکھ بھی اندو ہی کا تھا۔ ایک دن مدن کو اکیلے میں پاکر وہ پکڑ بیٹھی اور بولی "اتنا منہ پھلائے بیٹھے ہو۔ میں نے کیا کیا ہے؟"

مدن نے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا "چھوڑ ــــ دور ہو جا میری آنکھوں سے کمینی۔"

"یہی کہنے کے لئے اتنی دور سے بلوایا ہے؟"

"ہاں!" ــــ

"ہٹاؤ اب۔"

"خبردار ــــ یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے۔ تم جو آنا چاہتیں تو کیا بابو جی روک لیتے؟"

اندو نے بے بسی سے کہا "ہائے جی ــــ تم تو بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ میں بھلا انھیں کیسے کہہ سکتی تھی؟ سچ پوچھو تو تم نے مجھے بلوا کر بابو جی پر بڑا ظلم کیا ہے۔" "کیا مطلب؟"

"مطلب کچھ نہیں ــــ ان کا جی بہت لگا ہوا تھا بال بچوں میں۔"

"اور میرا جی؟"

"تمہارا جی؟ ــــ تم تو کہیں بھی لگا سکتے ہو۔" اندو نے شرارت سے کہا اور کچھ اس طرح سے مدن کی طرف دیکھا کہ اس کی مدافعت کی ساری توپیں ختم ہو گئیں۔ یوں بھی اسے کسی اچھے سے بہانے کی تلاش تھی۔ اس نے اندو کو پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور بولا۔ "بابو جی تم سے بہت خوش تھے۔"

"ہاں!" اندو بولی۔ "ایک دن میں جاگی تو دیکھا سرہانے کھڑے مجھے دیکھ رہے ہیں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔"

"اپنی قسم!"

"اپنی قسم نہیں ــــ میری قسم کھاؤ۔"

"تمہاری قسم تو میں نہیں کھاتی ــــ کوئی کچھ بھی دے۔"

"ہاں!" مدن نے سوچتے ہوئے کہا۔ "کتابوں میں اسے سیکس کہتے ہیں"۔

"سیکس؟" اندو نے پوچھا۔ "وہ کیا ہوتا ہے؟"

"وہی جو مرد اور عورت کے بیچ ہوتا ہے"۔

"ہائے رام!" اندو نے ایک دم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ "گندے کہیں کے — شرم نہیں آئی بابو جی کے بارے میں ایسا سوچتے ہوئے؟" — "تو بابو جی کو نہ آئی تجھے یوں دیکھتے ہوئے؟"

"کیوں؟" اندو نے بابو جی کی طرفداری کرتے ہوئے کہا۔ "وہ اپنی بہو کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے"۔

"کیوں نہیں۔ جب بہو تم ایسی ہو" — "تمہارا من گندا ہے"۔ اندو نے نفرت سے کہا۔ "اسی لئے تمہارا کاروبار بھی گندے پروچے کا ہے۔ تمہاری کتابیں سب گندگی سے بھری پڑی ہیں۔ تمھیں اور تمہاری کتابوں کو اس کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ایسے تو جب میں بڑی ہو گئی تھی تو میرے پتا جی نے مجھ سے ادھک پیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ تو کیا وہ بھی.... وہ تھا نگوڑا — جس کا تم ابھی نام لے رہے تھے"۔ اور پھر اندو بولی۔ "بابو جی کو یہاں بلا لو۔ ان کا وہاں جرا بھی جی نہیں لگتا۔ وہ دکھی ہوں گے تو کیا تم دکھی نہیں ہو گے؟"

مدن اپنے باپ سے بہت پیار کرتا تھا۔ گھر میں ماں کی موت نے بڑا ہونے کے کارن سب سے زیادہ اثر مدن ہی پر کیا تھا۔ اسے اچھی طرح سے یاد تھا۔ ماں کے بیمار رہنے کے باعث جب بھی اس کی موت کا خیال مدن کے دل میں آتا تو وہ آنکھیں موند کر پرارتھنا شروع کر دیتا — اوم نمو بھگوتے واسو دیوا۔ اوم نمو .... اب وہ نہیں چاہتا تھا باپ کی چھتر چھایا بھی سر سے اٹھ جائے۔ خاص طور پر ایسے میں جبکہ وہ اپنے کاروبار کو بھی جما نہیں پایا تھا۔ اس نے غیر یقینی لہجے میں اندو سے صرف اتنا کہا۔ "ابھی رہنے دو بابو جی کو۔ شادی کے بعد ہم دونوں پہلی بار آزادی کے ساتھ مل سکے ہیں" — تیسرے چوتھے روز بابو جی کا آنسوؤں میں ڈوبا ہوا خط آیا۔ میرے پیارے مدن کے تخاطب میں میرے پیارے کے الفاظ شور یا نیوں میں ڈھل گئے تھے۔ لکھا تھا۔

"بہو کے یہاں ہونے پر میرے تو وہی پرانے دن لوٹ آئے تھے۔ تمہاری ماں کے دن، جب ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی تو وہ بھی ایسی ہی الھڑ تھی۔ ایسے ہی اتارے ہوئے کپڑے ادھر ادھر پھینک دیتی اور پتا جی سمیٹتے پھرتے۔ وہی صندل کا صندلی، وہی بیسیوں خلجگن میں بازار جا رہا ہوں، آ رہا ہوں۔ الجھ نہیں تو وہی بڑے یار بڑی لا رہا ہوں۔ اب گھر میں کوئی نہیں۔ وہ جگہ جہاں

صندل کا صندوق پڑا تھا خالی ہے .... " اور پھر ایک آدھ سطر اور دھل گئی تھی ۔ آخر میں لکھا تھا " دفتر سے لوٹتے ہوئے یہاں کے بڑے بڑے اندھے کمروں میں داخل ہوتے ہوئے میرے من میں ایک ہُول سا اُٹھتا ہے ..... اور پھر ——" بہو کا خیال رکھنا ۔ اسے کسی ایسی ویسی دایہ کے حوالے مت کرنا " ۔ اندو نے دونوں ہاتھوں سے چٹھی پکڑ لی ۔ سانس کھینچی آنکھیں پھیلاتی ، شرم سے پانی پانی ہوتی ہوئی بولی " میں مر گئی ۔ بابوجی کو کیسے پتہ چل گیا ؟ "

مدن نے چٹھی چھڑاتے ہوئے کہا " بابوجی کیا بچے ہیں ؟ —— دنیا دیکھی ہے ۔ ہمیں پیدا کیا ہے " ۔

" ہاں مگر " ۔ اندو بولی " ابھی دن ہی کے ہوئے ہیں " ۔ اور پھر اس نے ایک تیز سی نظر اپنے پیٹ پر ڈالی جس نے ابھی بڑھنا بھی شروع نہیں کیا تھا اور جیسے بابوجی یہ کوئی اور دیکھ رہا ہو اس نے ساری کا پلو اس پر کھینچ لیا اور کچھ سوچنے لگی ۔ تبھی ایک چمک سی اس کے چہرے پر آئی اور وہ بولی " تمہاری سسرال سے شیرینی آئیگی " —— " میری سسرال ؟ —— اوہاں " ۔ مدن نے راستہ پاتے ہوئے کہا " کتنی شرم کی بات ہے ۔ ابھی چھ آٹھ مہینے شادی کو ہوئے ہیں اور چلا آیا ہے " ۔ اور اس نے اندو کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا ۔ " چلا آیا ہے یا تم لائے ہو ؟ "

" تم —— یہ سب قصور تمہارا ہے ۔ کچھ عورتیں ہوتی ہی ایسی ہیں " —— " تمہیں پسند نہیں ؟ "

" ایک دم نہیں " —— " کیوں ؟ "

" چار دن تو مزے لے لیتے زندگی کے " —— " کیا یہ زندگی کا مزا نہیں ؟ " اندو نے صدمہ زدہ لہجے میں کہا " مرد عورت شادی کس لئے کرتے ہیں ؟ بھگوان نے بن مانگے دے دیا نا ، پوچھو ان سے جن کے نہیں ہوتا ، پھر وہ کیا کچھ کرتی ہیں ؟ پیروں فقیروں کے پاس جاتی ہیں ۔ سمادھیوں مزاروں پر چوٹیاں باندھتی ، شرم و حیا کو تج کر ، دریاؤں کے کنارے ننگی ہو کر سرکنڈے کاٹتی ، شمشانوں میں مسان جگاتی —— "

" اچھا اچھا ! " مدن بولا " تم نے تو بکھان ہی شروع کر دیا ۔ اولاد کے لئے تھوڑی عمر پڑی تھی ؟ "

" ہوگا تو ! " اندو نے سرزنش کے انداز میں انگلی اٹھاتے ہوئے کہا " جب تم اسے ہاتھ بھی مت لگانا ۔ وہ تمہارا نہیں ، میرا ہوگا ۔ تمہیں تو اس کی ضرورت نہیں پر اس کے دادا کو بہت ہے یہ میں جانتی ہوں ! " اور پھر کچھ کھِل ، کچھ صدمہ زدہ ہو کر اندو نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا ۔

وہ سوچتی تھی پیٹ میں اس ننھی سی جان کو پالنے کے سلسلے میں ، اس جان کا ہوتا سوتا تھوڑی بہت

ہمدردی تو کرے گا ہی لیکن مدن چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ایک لفظ بھی اس نے منہ سے نہ نکالا۔ اندو نے چہرے پر سے ہاتھ اٹھا کر مدن کی طرف دیکھا اور ہونے والی پہلوٹن کے خاص انداز میں بولی۔ "وہ تو جو کچھ میں کہہ رہی ہوں سب سچ ہوگا۔ پہلے تو میں بچوں گی ہی نہیں۔۔۔ مجھے چین ہی سے وہم ہے اس بات کا۔" مدن بھی جیسے خائف ہو گیا — یہ خوبصورت چیز "جو حاملہ ہونے کے بعد اور بھی خوبصورت ہو گئی ہے 'مر جائے گی؟ اس نے پیٹھ کی طرف سے اندو کو تھام لیا اور پھر کھینچ کر اپنے بازوؤں میں لے آیا اور بولا "تجھے کچھ نہ ہوگا اندو۔۔۔ میں تو موت کے منہ سے بھی چھین کے لے آؤں گا تجھے — اب ساوتری کی نہیں ستیہ وان کی باری ہے۔"

مدن سے لپٹ کر اندو بھول ہی گئی کہ اس کا اپنا بھی کوئی دکھ ہے۔۔۔۔۔

اس کے بعد بابو جی نے کچھ نہ لکھا البتہ سہارنپور سے ایک سارٹر آیا جس نے صرف اتنا بتایا کہ بابو جی کو پھر سے دورے پڑنے لگے ہیں۔ ایک دورے میں تو قریب چل ہی بسے تھے۔ مدن ڈر گیا' اندو رونے لگی۔ سارٹر کے چلے جانے کے بعد ہمیشہ کی طرح مدن نے آنکھیں موندلیں اور من ہی من میں پڑھنے لگا — اوم نمو بھگوتے۔۔۔۔۔

دوسرے ہی روز مدن نے باپ کو چٹھی لکھی — "بابو جی! چلے آؤ۔۔۔ بچے بہت یاد کرتے ہیں اور آپ کی بہو بھی —" لیکن آخر نوکری ہی تھی۔ اپنے بس کی بات تھوڑی تھی۔ دھنی رام کے خط کے مطابق وہ چھٹی کا بندوبست کر رہے تھے۔۔۔۔ ان کے بارے میں دن بدن مدن کا احساسِ جرم بڑھنے لگا: "اگر میں اندو کو وہیں رہنے دیتا تو میرا کیا بگڑ جاتا —؟" وجے دشمی سے ایک رات پہلے مدن اضطراب کے عالم میں بیچ والے کمرے کے باہر برآمدے میں ٹہل رہا تھا کہ اندر سے بچے کے رونے کی آواز آئی اور وہ چونک کر دروازے کی طرف لپکا۔ بیگم دایہ باہر آئی اور بولی "مبارک ہو بابو جی — لڑکا ہوا ہے۔"

"لڑکا؟" مدن نے کہا اور پھر متفکرانہ لہجے میں بولا "بی بی کیسی ہے؟" بیگم بولی "خیر مہر ہے — میں نے ابھی تک اسے لڑکی ہی بتائی ہے۔۔۔ زچہ زیادہ خوش ہو جائے تو اس کی آنول نہیں گرتی نا۔"

"او۔۔۔" مدن نے بیوقوفوں کی طرح آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا اور پھر کمرے میں جانے کے لئے آگے بڑھا۔ بیگم نے اسے وہیں روک دیا اور کہنے لگی "تمہارا اندر کیا کام؟" اور پھر ایکا ایکی دروازہ بھیڑ کر

اندر لپک گئی۔ مدن کی ٹانگیں ابھی تک کانپ رہی تھیں۔ اس وقت خوف سے نہیں۔ تسلی سے یا شاید احساس کہ جب کوئی اس دنیا میں آتا ہے تو اردگرد کے لوگوں کی یہی حالت ہوتی ہے۔ مدن نے سن رکھا تھا جب لڑکا پیدا ہوتا ہے تو گھر کے در و دیوار لرزنے لگتے ہیں۔ گویا ڈر رہے ہیں کہ بڑا ہو کر ہمیں بیچے گا یا رکھے گا۔ مدن نے محسوس کیا جیسے سچ مچ ہی دیواریں کانپ رہی تھیں.... زچگی کے لئے چھلی بھابی تو نہ آ سکی تھی کیونکہ اس کا اپنا بچہ بہت چھوٹا تھا البتہ دریا باد والی پھوپھی ضرور پہنچ گئی تھی جس نے پیدائش کے وقت رام رام رام کی رٹ لگا دی تھی اور اب وہی رٹ مدھم ہو رہی تھی۔ زندگی بھر مدن کو اپنا آپ اس قدر فضول اور بیکار نہ لگا تھا۔ اتنے میں پھر دروازہ کھلا اور پھوپھی نکلی۔ برآمدے کی بجلی کی مدھم سی روشنی میں اس کا چہرہ بھوت کے چہرے کی طرح ایک دم سفید دکھائی نظر آ رہا تھا۔ مدن نے اس کا رستہ روکتے ہوئے کہا "اندو ٹھیک ہے نا پھوپھی؟"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے!" پھوپھی نے تین چار بار کہا اور پھر اپنا لرزتا ہوا ہاتھ مدن کے سر پہ رکھ کر اسے نیچا کیا، چوما اور باہر لپک گئی —

پھوپھی برآمدے کے دروازے میں سے باہر جاتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ بیٹھک میں پہنچی جہاں باقی کے بچے سو رہے تھے۔ پھوپھی نے ایک ایک کے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرا اور پھر چھت کی طرف آنکھیں اٹھا کر منہ میں کچھ بولی اور پھر نڈھال سی ہو کر منی کے پاس لیٹ گئی — اوندھی۔ اس کے پھڑکتے ہوئے شانوں سے پتہ چل رہا تھا جیسے رو رہی ہے۔ مدن حیران ہوا.... پھوپھی تو کئی زچگیوں سے گذر چکی ہے، پھر کیوں اس کی روح تک کانپ اٹھی ہے — پھر ادھر کے کمرے سے ہرمل کی بو باہر لپکی۔ دھوئیں کا ایک غبار سا آیا جس نے مدن کا احاطہ کر لیا۔ اس کا سر چکرا گیا۔ جبھی بیگم دایہ کپڑے میں کچھ لپیٹے ہوئے باہر نکلی۔ کپڑے پر خون ہی خون تھا جس میں کچھ قطرے نکل کر فرش پہ گر گئے۔ مدن کے ہوش اڑ گئے۔ اسے معلوم نہ تھا وہ کہاں ہے۔ آنکھیں کھلی تھیں پر کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ بیچ میں اندو کی ایک مرگھلی سی آواز آئی۔ "ہائے —" اور پھر بچے کے رونے کی آواز — تین چار دن میں بہت کچھ ہوا۔ مدن نے گھر کے ایک طرف گڑھا کھود کر آنول کو دبایا۔ کتوں کو اندر آنے سے روکا۔ لیکن اسے کچھ یاد نہ تھا۔ اسے یوں لگا جیسے ہرمل کی بو دماغ میں بس جانے کے بعد آج ہی اسے ہوش آیا ہے۔ کمرے میں وہ اکیلا ہی تھا اور اندو.... نند اور جسودھا — اور دوسری طرف نندلال.....

اندو نے بچے کی طرف دیکھا اور کچھ ٹوہ لینے کے سے انداز میں بولی "بالکل تم ہی پر گیا ہے"۔

"ہوگا" مدن نے ایک اچٹتی سی نظر بچے پر ڈالتے ہوئے کہا "میں تو کہتا ہوں شکر ہے بھگوان کا کہ تم پر نہ گئی۔"

"ہاں!" اندو بولی "میں تو سمجھتی تھی —"

"شبھ شبھ بولو۔" مدن نے ایک دم اندو کی بات کاٹتے ہوئے کہا "یہاں تو جو کچھ ہوا ہے... میں تو اب تمہارے پاس نہیں پھٹکوں گا" اور مدن نے زبان دانتوں تلے دبالی۔ "توبہ کرو" اندو بولی۔

مدن نے اسی دم کان اپنے ہاتھوں سے پکڑ لیے.... اور اندو خفیف سی آواز میں ہنسنے لگی۔ بچہ پیدا ہونے کے بعد کئی روز تک اندو کی ناف ٹھکانے پہ نہ آئی۔ وہ گھوم گھوم کر اس بچے کی تلاش کر رہی تھی جو اب اس کے پیٹ سے باہر کی دنیا میں جا کر اپنی اصلی ماں کو بھول گیا تھا۔ اب سب کچھ ٹھیک تھا اور اندو شانتی سے اس دنیا کو تک رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا اس نے مدن ہی کے نہیں دنیا بھر کے گناہگاروں کے گناہ معاف کر دیے ہیں اور ایک دیوی بن کر دیا اور کرونا کے پرساد بانٹ رہی ہے.... مدن نے اندو کے منہ کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا — اس سارے خون خرابے کے بعد کچھ دبلی ہو کر اندو اور بھی اچھی لگنے لگی ہے... جبھی ایکا ایکی اندو نے دونوں ہاتھ اپنی چھاتیوں پر رکھ لیے۔ "کیا ہوا؟" مدن نے پوچھا۔

"کچھ نہیں" اندو تھوڑا سا اٹھنے کی کوشش کر کے بولی "اسے بھوک لگی ہے"۔ اور اس نے بچے کی طرف اشارہ کیا — "اسے؟ — بھوک؟ —" مدن نے پہلے بچے کی طرف اور پھر اندو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہیں کیسے پتہ چلا؟"

"دیکھتے نہیں؟" اندو نیچے کی طرف نگاہ کرتے ہوئے بولی "سب گیلا ہو گیا ہے۔" مدن نے غور سے اندو کے ڈھیلے ڈھالے جھگلے کی طرف دیکھا۔ چھر چھر دودھ بہ رہا تھا اور ایک خاص قسم کی بو آ رہی تھی۔ پھر اندو نے بچے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "اسے مجھے دے دو!"

مدن نے ہاتھ پنگھوڑے کی طرف بڑھایا اور اسی دم کھینچ لیا۔ پھر کچھ ہمت سے کام لیتے ہوئے اس نے بچے کو یوں اٹھایا جیسے وہ کوئی مرا ہوا چوہا ہو۔ آخر اس نے بچے کو اندو کی گود میں دے دیا۔

اندو مدن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "تم جاؤ... باہر"

"کیوں؟ .... باہر کیوں جاؤں؟" مدن نے پوچھا۔

"جاؤ نا" — اندو نے کچھ مچلتے، کچھ شرماتے ہوئے کہا "تمہارے سامنے میں دودھ نہیں پلا سکوں گی۔"

"ارے؟" مدن حیرت سے بولا "میرے سامنے؟ ... نہیں پلا سکے گی؟" اور پھر ناسمجھی کے انداز میں

سر کو جھٹکا دیکر باہر کی طرف چل نکلا دروازے کے پاس کا چکر کاٹتے ہوئے اس نے اندو پر ایک نگاہ ڈالی اتنی خوبصورت اندو آج کتنی بوڑھی ہوگئی تھی
بابو جی نے رام چھٹی پر گھر لوٹے تو وہ پہلے سے آدھے دکھائی پڑتے تھے۔ اندو نے جب پوتا انکی گود میں دیا تو وہ کھل اٹھے۔ ان کے
پیٹ کے اندر کوئی پھوڑا نکل آیا تھا جو چوبیس گھنٹے انہیں سولی پر لٹکائے رکھتا۔ اگر مثانہ ہوتا تو بابو جی کی اس سے دس گنا
بُری حالت ہوتی۔ کئی علاج کئے گئے بابو جی کے آخری علاج میں ڈاکٹر نے ادھنی کے برابر پندرہ بیس گولیاں روز کھانے
کو دیں۔ پہلے ہی دن انہیں اتنا پسینہ آیا کہ دن میں تین تین چار چار بار کپڑے بدلنے پڑے۔ ہر بار مدن کپڑے اتار کر
بالٹی میں نچوڑتا تو صرف پسینہ ہی پسینہ بالٹی ایک چوتھائی ہوگئی تھی۔ رات انہیں متلی سی محسوس ہونے لگی اور انہوں نے پکارا۔
"چھوٹی بہو! ذرا داتن تو دینا ذائقہ بہت خراب ہو رہا ہے۔" بہو بھاگی ہوئی گئی اور داتن لے آئی بابو جی اٹھ کر داتن
چبا رہے تھے کہ ایک ابکائی آئی ساتھ ہی خون کا پرنالہ لے آئی۔ بیٹے نے واپس سرہانے کی طرف لٹایا تو
ان کی پتلیاں پھر چکی تھیں اور کوئی ہی دم میں وہ اوپر آسمان کے گلزار میں پہنچ چکے تھے جہاں انہوں نے اپنا
پھول پہچان لیا تھا ـــــ بیٹے کو پیدا ہوئے کل بیس پچیس روز ہوئے تھے۔ اندو نے منہ نوچ کر، سر اور چھاتی
پیٹ پیٹ کر خود کو نیلا کر لیا۔ مدن کے سامنے وہی منظر تھا جو اس نے تصور میں اپنے مولے پہ دیکھا تھا۔ فرق صرف
اتنا تھا کہ اندو نے چوڑیاں توڑنے کی بجائے اتار کے رکھ دی تھیں۔ سر پہ راکھ نہیں ڈالی تھی لیکن زمین پہ مٹی لگ
جانے اور بالوں کے بکھر جانے سے چہرہ بھیانک ہو گیا تھا۔ "لوگو! میں لٹ گئی" کی جگہ اس نے ایک دلدوز آواز میں چلانا
شروع کر دیا تھا "لوگو! ہم لٹ گئے!" ـــ گھر بار کا کتنا بوجھ مدن پر آپڑا تھا۔ اس کا ابھی مدن کو پوری طرح سے
اندازہ نہ تھا۔ صبح ہونے تک اس کا دل لپک کر منہ میں آگیا۔ وہ شاید بچ نہ پاتا اگر وہ گھر کے باہر بدرو کے
کنارے سیل چڑھی مٹی پر اوندھا لیٹ کر اپنے دل کو ٹھکانے پر نہ لاتا . . . . دھرتی ماں نے چھاتی سے لگا کر اپنے
بچے کو بچا لیا تھا۔ چھوٹے بچے کندن، دلاری منی، پاشی یوں چلا رہے تھے جیسے گھونسلے پر شکرے کے حملے پر چڑیا کے بوٹے
چونچیں اٹھا اٹھا کر چیں چیں کیا کرتے ہیں۔ انہیں اگر کوئی پروں کے نیچے سمیٹتی تھی تو اندو۔ نالی کے کنارے
پڑے پڑے مدن نے سوچا اب تو یہ دنیا میرے لئے ختم ہو گئی۔ کیا میں جی سکوں گا؟ زندگی میں کبھی ہنس بھی
سکوں گا؟ وہ اٹھا اور اٹھ کر گھر کے اندر چلا آیا۔

سیڑھیوں کے نیچے غسل خانہ تھا جس میں گھس کر اندر سے کواڑ بند کرتے ہوئے مدن نے ایک بار پھر اس سوال کو دہرایا۔ کبھی
میں بھی ہنس بھی سکونگا؟ ـــ بعد وہ کھلکھلا کر ہنس رہا تھا حالانکہ ابھی باپ کی لاش بھی پاس ہی بیٹھک میں پڑی تھی۔
باپ کو آگ کے حوالے کرنے سے پہلے مدن، ارتھی پر پڑے ہوئے جسم کے سامنے ڈنڈوت کے انداز میں

اپنے مخلص دوست

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

استاد شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی

کے نام

ایم۔ حبیب خاں

لیٹ جاگیا۔ جو اس کا اپنے جنم داتا کو آخری پرنام تھا۔ تس پر بھی وہ رو نہ رہا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر ماتم میں شریک ہونے والے رشتے دار محلے والے سن رہ گئے۔ پھر ہندو رواج کے مطابق سب سے بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے مدن کو چتا جلانی پڑی۔ جلتی ہوئی کھوپڑی میں کپال کریا کی لاٹھی مارنی پڑی۔۔۔ عورتیں باہر ہی سے شمشان کے کنوئیں پر نہا کر گھر لوٹ چکی تھیں۔ جب مدن گھر پہنچا تو وہ کانپ رہا تھا۔ دھرتی ماں نے تھوڑی دیر کے لیے جو طاقت اپنے بیٹے کو دی تھی، رات کے گھر آنے پر چہرے سے ہونٹوں میں ڈھل گئی۔۔۔۔۔ اسے کوئی سہارا چاہیے تھا، کسی ایسے جذبے کا سہارا جو موت سے بھی بڑا ہو۔ اس وقت دھرتی ماں کی بیٹی جنک دلاری اندو نے کسی گھڑے میں سے پیدا ہو کر اس رام کو اپنی باہوں میں لے لیا۔۔۔ اس رات اگر اندو اپنا آپ یوں مدن پر نثار نہ کر دیتی تو اتنا بڑا دکھ مدن کو لے ڈوبتا۔

دس ہی مہینے کے اندر اندر اندو کا دوسرا بچہ چلا آیا۔ بیوی کو اس دوزخ کی آگ میں دھکیل کر مدن خود اپنا دکھ بھول گیا تھا۔ کبھی کبھی اسے خیال آتا اگر میں شادی کے بعد بابو جی کے پاس گئی ہوئی اندو کو نہ بلا لیتا تو شاید وہ اتنی جلدی نہ چل دیتے۔ لیکن پھر وہ باپ کی موت سے پیدا ہونے والے خسارے کو پورا کرنے میں لگ جاتا۔۔۔۔۔ کاروبار جو پہلے بے توجہی کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ مجبوراً چل نکلا۔ ان دنوں بڑے بچے کو مدن کے پاس چھوڑ کر، چھوٹے کو چھاتی سے لگائے اندو میکے چلی گئی تھی۔ پیچھے منا طرح طرح کی ضد کرتا تھا جو کبھی مانی جاتی تھی اور کبھی نہیں بھی۔ میکے سے اندو کا خط آیا۔۔۔ مجھے یہاں اپنے بیٹے کے رونے کی آواز آ رہی ہے، اسے کوئی مارتا تو نہیں؟۔۔۔۔۔ مدن کو بڑی حیرت ہوئی۔ ایک جاہل، ان پڑھ عورت۔۔۔۔ ایسی باتیں کیسے لکھ سکتی ہے؟ پھر اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ کیا یہ بھی کوئی رٹا ہوا فقرہ ہے؟ سال گذر گئے، پیسے کبھی اتنے نہ آئے کہ ان سے کچھ عیش ہو سکے لیکن گذارے کے مطابق آمدنی ضرور ہو جاتی تھی۔ دقت اس وقت ہوتی جب کوئی بڑا خرچ سامنے آ جاتا۔۔۔۔۔ کندن کا داخلہ دینا ہے، دلاری منی کا شگن بھیجنا ہے۔ اس وقت مدن منہ لٹکا کر بیٹھ جاتا۔ اور پھر اندو ایک طرف سے مسکراتی ہوئی آتی اور کہتی "کیوں دکھی ہو رہے ہو؟" مدن امید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا "دکھی نہ ہوں؟ کندن کا بی اے کا داخلہ دینا ہے۔۔۔۔ منی۔۔۔" اندو پھر ہنستی اور کہتی "چلو میرے ساتھ آؤ"

مدن بھیڑ کے بچے کی طرح اندو کے پیچھے چل دیتا۔ اندو صندل کے صندوق کے پاس پہنچتی جسے کسی کو مدن سمیت ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی کبھی کبھی اس بات پر خفا ہو کر مدن کہتا "مروگی تو اسے بھی چھاتی پر ڈال کر لے جانا"۔ اور اندو کہتی "ہاں لیجاؤں گی"۔ پھر اندو وہاں سے مطلوبہ رقم نکال کر سامنے رکھ دیتی۔

"یہ کہاں سے آ گئے؟"

"کہیں سے بھی آئے ..... تمھیں آم کھانے سے مطلب ہے؟" — "پھر بھی؟" "تم جاؤ اپنا کام کرو"

اور جب مدن زیادہ اصرار کرتا تو اندو کہتی "میں نے ایک سیٹھ دوست بنایا ہے نا؟" اور پھر ہنسنے لگتی جھوٹ جانتے ہوئے بھی مدن کو یہ مذاق اچھا نہ لگتا۔ پھر اندو کہتی "میں چور لٹیرا ہوں — تم نہیں جانتے؟ — سخی لٹیرا — جو ایک ہاتھ سے لوٹتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے غریب غربا کو دے دیتا ہے" ..... اسی طرح منی کی شادی ہو گئی جس پر ایسی ہی لوٹ کے زیور کپڑے چڑھا اور پھر اتر بھی گیا۔ ایسے ہی کندن بھی بیاہا گیا۔

نئی بھابی آئی کہنے کو تو وہ بھی بیوی تھی لیکن اندو ایک عورت تھی جسے بہو کہتے ہیں اس کے الٹ چھوٹی بھابی رانی ایک بیوی تھی جسے عورت کہتے ہیں۔ رانی کے کارن بھائیوں میں جھگڑا ہوا اور جے پی چاچا کی معرفت جائیداد تقسیم ہوئی جس میں ماں باپ کی جائیداد تو ایک طرف اندو کی اپنی بنائی ہوئی چیزیں بھی تقسیم کی زد میں آ گئیں اور اندو کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔ — جہاں سب کچھ مل جانے کے بعد اور الگ ہو کر بھی کندن اور رانی ٹھیک سے نہیں بس سکے وہاں اندو کا نیا گھر دنوں ہی میں جگ مگ جگ مگ کرنے لگا۔ بچی کی پیدائش کے بعد اندو کی صحت وہ نہ رہی [illegible] اندو کی چھاتیوں میں جسم کی [illegible] رہتی تھی۔ جہاں سبھی گوشت کے اس لوتھڑے پر تھو تھو کرتے تھے وہاں ایک اندو تھی جو اسے کلیجے سے لگائے پھرتی۔ لیکن کبھی خود بھی پریشان ہو اٹھتی اور بچی کو سامنے جھلنگے میں پھینکتے ہوئے کہہ اٹھتی "تو مجھے بھی جینے دے گی — ماں — ؟"

اور بچی چلا چلا کر رونے لگتی۔

مدن اندو سے کھنچنے لگا۔ شادی کے بعد اس وقت تک اسے وہ عورت نہ ملی تھی جس کا وہ متلاشی تھا۔ گندہ بدبودار [illegible] بکنے لگا اور مدن نے بہت سا روپیہ اندو سے بالا بالا خرچ کرنا شروع کر دیا۔ بابو جی کے چلے جانے پر کوئی پوچھنے والا بھی تو نہ تھا۔ پوری آزادی تھی۔ گویا دیکھا سمٹے کی بھینس پھر مدن کے منہ کے پاس آ کر پھنکارنے لگی بلکہ بار بار پھنکارنے لگی۔ شامو کی [illegible] والی بھینس تو بک چکی تھی لیکن اس کا مالک زندہ تھا۔ مدن اس کے ساتھ ایسی جگہوں پر جانے لگا جہاں روشنی اور سایے عجیب بے قاعدہ سی شکلیں بناتے ہیں۔ نکڑ پر کبھی اندھیر کی تکون بنتی ہے کہ اوپر کھٹ سے روشنی کی ایک چوکور آ کر اسے کاٹ دیتی ہے کوئی تصویر پوری نہیں بنتی۔ معلوم ہوتا ہے بغل سے ایک پاجامہ نکلا اور آسمان کی طرف اڑ گیا یا کسی کوٹ نے دیکھنے والے کا منہ پوری طرح سے ڈھانپ لیا اور کوئی سانس کے لیے تڑپنے لگا۔ جبھی روشنی کی چوکور ایک چوکھٹا سی بن گئی اور اس میں ایک صورت آ کر کھڑی ہو گئی۔ دیکھنے والے نے ہاتھ بڑھایا تو وہ آر پار چلا گیا جیسے وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ پیچھے کوئی کتا رونے لگا اور طبلے نے اس کی آواز ڈبو دی۔ مدن کو اس کے تصور کے خد و خال مل گئے لیکن ہر جگہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آرٹسٹ سے ایک خط غلط لگ گیا یا ہنسی کی آواز ضرورت سے زیادہ بلند تھی اور مدن بے داغ مشاکلہ اور متوازن ہنسی کی تلاش میں کھو گیا۔ سیٹھ نے اس وقت اپنی بیوی کی بات کی [illegible] اس کی بیگم نے مدن کو شمالی شہری کی حیثیت سے سیٹھ کے سامنے پیش کیا [illegible]

کروٹ کروٹ گائی بھی ہوئی بیگم نے حافظے کی ٹوکری میں سے سودا اور بیج اٹھانے اور مدن کے صاف ستھرے صحن میں بکھیر دیے۔ ایک اندو کی بجائے دو اندو ہو گئیں۔ ایک تو اندو خود تھی اور دوسری ایک کانپتا ہوا خط جو اندو کے پورے جسم کا احاطہ کئے ہوئے تھا اور جو نظر نہیں آ رہا تھا۔۔۔۔۔

مدن کہیں جاتا بھی تھا تو گھر سے ہو کر۔۔۔۔ نہا دھو اچھے کپڑے پہن، کنگھی کی ایک چوٹی جس میں خوشبودار تیل لگا ہوا منہ میں رکھ کر۔۔۔۔ لیکن اس دن جو مدن گھر آیا تو اندو کی شکل ہی دوسری تھی۔ اس نے چہرے پر پوڈر تو بکھا تھا، گالوں پر روج لگا رکھی تھی۔ لپ اسٹک نہ ہونے پر ہونٹ ماتھے کی بندی کے رنگ لیے تھے۔۔۔ اور بال کچھ اس طرح بنے تھے، بنائے تھے کہ مدن کی نظریں ان میں الجھ کے رہ گئیں۔ "کیا بات ہے آج؟" مدن نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" اندو نے مدن کی نظریں بچاتے ہوئے کہا۔ "آج فرصت ملی ہے۔"۔۔ شادی کے پندرہ برس گزر جانے کے بعد اندو کو آج فرصت ملی تھی اور وہ بھی اس وقت جبکہ چہرے پر چھائیاں چلی آئی تھیں، ناک پہ ایک سیاہ سی کاٹھی پڑ گئی تھی اور بلاؤز کے نیچے ننگے پیٹ کے پاس کمر پر چربی کی دو تین تہیں سی دکھائی دینے لگی تھیں۔۔ آج اندو نے ایسا بندوبست کیا تھا کہ ان عیوب میں سے ایک بھی پہلی نظر نہ آتا تھا۔ یوں بنی ٹھنی، کسی کسائی وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ "یہ نہیں ہو سکتا۔" مدن نے سوچا اور اسے ایک دھچکا سا لگا۔ اس نے پھر ایک بار مڑ کر اندو کی طرف دیکھا۔ جیسے گھوڑوں کے بیوپاری کسی نامی گھوڑی کی طرف دیکھتے ہیں۔۔۔ وہاں گھوڑی بھی تھی اور لال لگام بھی۔۔۔ یہاں جو غلط لگے تھے شرابی آنکھوں کو نہ دیکھ سکے۔۔۔ اندو بے شک خوبصورت تھی۔ آج بھی پندرہ سال کے بعد کیوٹا، رئیسہ، مسز رابرٹ اور انکی بہنیں اس کے سامنے پانی بھرتی تھیں۔۔۔ پھر مدن کو رحم آنے لگا اور ایک ڈر ۔۔۔ سے ڈولی

اس سے پہلے کہ مدن اندو کی طرف ہاتھ بڑھاتا اندو خود ہی مدن سے لپٹ گئی۔ پھر مدن نے ہاتھ سے اندو کی ٹھوڑی اوپر اٹھا لی اور دیکھنے لگا۔ افسوس نے کیا کھویا، کیا پایا؟ اندو نے ایک نظر مدن کے سیاہ ہوتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھی اور آنکھیں بند کر لیں۔

"یہ کیا؟" مدن نے چونکتے ہوئے کہا: "تمہاری آنکھیں سوجی ہوئی ہیں!"

"یونہی!" اندو نے کہا اور منی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "رات بھر جگایا ہے اس چڑیل منیا نے۔" منی ابھی تک خاموش ہو چکی تھی گویا وہ دم سادھے دیکھ رہی تھی۔ اب کیا ہونے والا ہے؟ آسمان سے پانی پڑنا بند ہو گیا تھا۔ واقعی آسمان سے پانی پڑنا بند ہو گیا تھا۔ مدن نے پھر غور سے اندو کی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "ہاں مگر ۔۔۔ یہ آنسو؟"

"خوشی کے ہیں۔" اندو نے جواب دیا۔ "آج کی رات میری ہے۔" اور پھر ایک عجیب سی ہنسی ہنستی ہوئی وہ مدن سے چمٹ گئی۔ ایک تلذذ کے احساس سے مدن نے کہا: "آج برسوں بعد میرے من کی مراد پوری ہوئی اندو۔ میں نے ہمیشہ چاہا تھا۔"

"لیکن تم نے کہا نہیں۔" اندو بولی۔ "یاد ہے شادی کی رات میں نے تم سے کچھ مانگا تھا؟"

"ہاں!" مدن بولا۔ "اپنے دکھ مجھے دے دو۔" ۔۔۔ "تم نے تو کچھ نہیں مانگا مجھ سے؟"

"میں نے؟" مدن نے حیران ہوتے ہوئے کہا "میں کیا مانگتا؟ میں تو جو کچھ مانگ سکتا تھا وہ سب تم نے دے دیا۔ میرے عزیزوں سے پیار۔۔۔ ان کی تعلیم، بیاہ شادیاں، یہ پیارے پیارے بچے ۔۔۔ یہ سب کچھ تو تم نے دے دیا۔"

"میں بھی یہی سمجھتی تھی۔" اندو بولی۔ "لیکن اب جا کر پتہ چلا ایسا نہیں۔" "کیا مطلب؟" "کچھ نہیں۔" پھر اندو نے رک کر کہا۔ "میں نے بھی ایک چیز رکھ لی ہے۔" "کیا چیز رکھ لی؟" اندو کچھ دیر چپ رہی اور پھر اپنا منہ پرے کرتے ہوئے بولی۔ "اپنی لاج، اپنی خوشی ۔۔۔ اس وقت تم بھی کہہ دیتے۔ اپنے سکھ مجھے دے دو۔ تو میں ۔۔۔" اور اندو کا گلا رندھ گیا۔ اور کچھ دیر بعد وہ بولی۔ "اب تو میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔" مدن کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ زمین میں گڑ گیا۔ یہ ان پڑھ عورت! وہی رٹا ہوا فقرہ ۔۔۔ نہیں تو ۔۔۔ یہ تو ابھی سامنے ہی زندگی کی بھٹی سے نکلا ہے ابھی تو اس پر برابر ہتھوڑے پڑ رہے ہیں اور چنگاریاں چاروں طرف اڑ رہی ہیں۔۔۔ کچھ دیر کے بعد مدن کے ہوش ٹھکانے آئے اور بولا۔ "میں سمجھ گیا اندو۔" پھر روتے ہوئے مدن اور اندو ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔۔۔ اندو نے مدن کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایسی دنیاؤں میں لے گئی جہاں انسان مر کر ہی پہنچ سکتا ہے۔

پرتھو

جب وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈبے کے اندر آیا تو اس کے چلنے انداز سے میں نے محسوس کیا کہ فوج میں ملازم رہ چکا ہے۔ اس کی شخصیت بڑی پُروقار ہے، قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا۔ رنگ سُرخ و سپید براق بزرانی ڈاڑھی۔ اس نے کالی سرج کے رنگ کا ادنی سوٹ پہن رکھا تھا اور ڈبے کے درمیان روشنی میں اس کی پگڑی کی تہوں میں سے ابرق کے ٹکڑے جواہر ریزوں کی طرح چمک اٹھتے تھے۔ وہ سیدھا چلتا ہوا متوازن قدم اٹھاتا ہوا میرے قریب آکر رکا جھک کر اس نے قریب کی سیٹ کا نمبر پڑھا اور اطمینان کا سانس لے کر سیٹ پر دراز ہو گیا۔ سیٹ اس کے وزن سے پیچھے کو ہو گئی اس نے مزید اطمینان کی سانس لی اور میری طرف دیکھ کر بولا "یہ پیچھے کو ہٹنے والی کلدار نشستیں بہت عمدہ ہیں!" میں نے اپنا جلتا ہوا سگریٹ جسے میں نے ابھی ابھی سلگایا تھا جلدی سے خاکدان میں بجھا دیا۔ بوڑھا سکھ میری طرف دیکھکر مسکرایا اور اس نے کہا شکریہ! مجھے تمباکو کا دھواں واقعی بہت بُرا معلوم ہوتا ہے۔

مجھے اس کے دانت، جب وہ مسکرایا تو بہت اچھے معلوم ہوئے بے حد سپید اور مضبوط دانت جڑے جڑے اور ہم سطح اس بوڑھے فوجی سکھ کی عمر ستّر برس سے کم نہ ہو گی۔ لیکن اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں اب بھی جوانی کی چمک اور اس کا تجسّس پایا جاتا تھا۔ اس عمر میں بھی وہ غیر معمولی طور پر صحت مند دکھائی دیتا تھا۔ لیکن اس میں کوئی

شبہ نہیں کہ جوانی میں تو وہ بے حد حسین اور دلآویز شخصیت کا مالک رہا ہوگا اس وقت اس کے چہرے پر مجھے جو چیز کھل رہی تھی وہ متعدد زخموں کے نشان تھے۔ دائیں بائیں اس کے رخساروں پر تین چار لانبے لانبے زخموں کے نشان رہ گئے تھے۔ دائیں رخسار پر تو زخموں نے ایک صلیب سی بنا ڈالی تھی اور بائیں رخسار پر یہ زخم انگریزی میں "V" کا نشان بنائے تھے اور جب اس نے اپنی ٹائی ٹھیک کرنے کے لئے ہاتھ اوپر کئے تو میں نے دیکھا کہ اس کی ہتھیلیوں کی پشت پر بھی زخم کے ایسے چھوٹے چھوٹے بیسیوں نشان ہیں۔ جیسے کسی نے تیز دھار کے چاقو سے ان ہاتھوں کا قیمہ بنانے کی کوشش کی ہو۔

جنگ! میں نے اپنے دل میں سوچا۔ جانے پہلی جنگ عظیم کے محاذ پر اسے یہ حادثہ پیش آیا ہوگا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ خوبصورت اور وجیہہ انسان کی بانہہ یا ٹانگ نہیں گئی ورنہ کتنا برا معلوم ہوتا یہ آدمی

مجھے اس معاملہ پر زیادہ غور کرنے کا موقع نہیں ملا۔ کیونکہ ریستوران کار کے بیرے نے آکر کہا کہ اب آپ لوگ آکر کھانا کھالیں، ہم لوگ دس بجے ریستوران بند کر دیتے ہیں۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بوڑھا سکھ میرے ساتھ اُٹھ گیا۔

"حالانکہ میں آٹھ بجے گھر سے کھانا کھا کر چلا تھا۔ مگر اس وقت پھر بھوک محسوس کر رہا ہوں۔" بوڑھا سکھ ہنس کر مجھ سے مخاطب ہوا۔

اور میں اس لئے دیر میں کھا رہا ہوں کہ مجھے بھوک نہ تھی! میں نے جواب دیا۔

ہم دونوں ڈائننگ کار میں جا کر بیٹھ گئے۔ وہاں بیروں کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ صرف ایک کونے کی میز پر ایک نوجوان جوڑا کافی پی رہا تھا۔ اور کھڑکی سے باہر رک رک کر پورنماشی کے چاند کو دیکھ رہا تھا۔

لڑکی کا ہاتھ مرد کے ہاتھ میں تھا جسے وہ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد دبا دیتا تھا۔ ہاتھ کے دبانے سے لڑکی کے چہرے پر ایک گلنار مسکراہٹ کھل اٹھتی تھی اور مجھے ایسا محسوس ہوتا۔ جیسے لڑکے کے ہاتھ میں کوئی سوئچ (Switch) ہے کہ جسے بار بار دبانے سے یہ مسکراہٹ بجلی کے قمقمے کی طرح روشن ہو اٹھتی۔ لڑکی کے بال خوش نما طریق سے کٹے ہوئے تھے اور وہ بڑی دلربا صورت والی، موہنی اداؤں والی لڑکی تھی اور شکل و صورت سے ایک ایسی ہندوستانی کرسچن معلوم ہوتی تھی جس میں یورپی خون کا بھی دخل رہا ہو۔ لڑکا خالص ہندوستانی تھا۔ سانولے رنگ کا چھوٹا قد لیکن مضبوط اور گٹھا ہوا۔ گھنے چمکیلے بال اور چوڑے چوڑے جبڑوں پر گھٹے ہوئے شیو کی نیلاہٹ تھی۔ اس کے سر کی حجامت بالکل تازہ تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ آج ہی بال کٹوا کر آیا ہے۔ اس کے کپڑے بے حد صاف ستھرے تھے۔ اس کے روئیں روئیں سے زندگی کی صحت مند آرزوئیں پھوٹ رہی تھیں۔

لڑکی کا ایک ہاتھ اس نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور بار بار وہ اسے اس طرح دباتا تھا جس طرح گویا وہ اس میں برقی رو بھرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ دوسرے ہاتھ سے وہ اس کی نیلی ساڑھی کا پلو برابر سکے جا رہا تھا اور اس کی بے حد سیاہ چھوٹی اور چمکیلی آنکھیں لڑکی کو اس طرح دیکھتی تھیں جیسے وہ لڑکی نہ ہو۔ حُسن کی ایک پلیٹ ہو۔ "محبت میں صحت کو کس قدر دخل ہے" میں نے اپنے زرد رخساروں کو آہستہ سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

جواب میں بوڑھے سکھ نے کچھ نہ کہا۔ کیونکہ کھانا اب ہم دونوں کے سامنے تھا اور وہ مکمل انہماک سے کھانے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ ہمارے کھانے کے دوران ہی میں وہ جوڑا کافی پی کر اور

بل ادا کر کے چلا گیا۔ چلتے چلتے وہ گلنار مسکراہٹ پھر لڑکی کے لبوں تک آئی اور مجھے اس لڑکی کی وہ گلنار مسکراہٹ اس کے تبسم کی ادا بے حد پسند آئی۔ جب وہ لڑکے کی طرف دیکھتی تھی کتنی چاہت اور سپردگی تھی اس کی نگاہ میں۔ کبھی کبھی تو عورت ایک نگاہ میں سب کچھ دے ڈالتی ہے اور پھر ایک خالی برتن کی طرح معصوم کھڑی کی کھڑی دیکھتی رہ جاتی ہے، بس اسی وقت وہ سب سے پیاری معلوم ہوتی ہے۔ مسکرانے کے بعد کچھ اس طرح کی نگاہ سے اس لڑکی نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا تھا اور پھر ٹھٹھک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور نوجوان اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے دیٹی بیول میں لے گیا تھا اور اُن کے جانے کے بعد ریستوران کار اور بھی سونی سونی سی دکھائی دینے لگی اور کھڑکی میں لٹکا ہوا چاند مجھے ایسا محسوس ہوا گویا صرف انھیں کے لئے لٹکایا گیا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی پر پردہ ڈال دیا۔

بوڑھا سکھ میری حرکت پر مسکرایا۔ مگر خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ کھانا کھانے کے بعد بوڑھے سکھ نے کافی منگائی اور میں سگریٹ پینے کے لئے دیٹی بیول میں آگیا۔ دیٹی بیول کے ایک کونے میں وہ نوجوان اس لڑکی کو چوم رہا تھا اور چاند لڑکی کے چہرے پر تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

لڑکے نے حیران ہو کر پوچھا۔ "یہ آنسو کیسے ہیں"؟

کچھ نہیں یونہی؟ لڑکی اپنے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے بولی اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس کے چہرے پر وہ دلآویز تبسم بن موہنا۔ محبت میں ڈوبا ہوا گلنار تبسم۔

لڑکے نے پھر اسے ایک بار چوما۔

لڑکی کے شانے کانپے۔ اس نے ٹھٹھر کے کہا۔ "چلو ڈارلنگ

اندر چلیں یہاں سردی ہے"..... اس نے خاموشی سے اپنی نگاہوں سے میری طرف اشارہ کیا جو دوسری کھڑکی میں کھڑا بظاہر باہر پورنیا کے چاند کو دیکھ رہا تھا۔ لڑکے نے میری طرف اس طرح دیکھا گویا مجھے ابھی چھرا بھونک دے گا۔ پھر اس نے آہستہ سے گھوم کر لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے ویٹی بیول سے نکال کر اندر ڈبے میں لے گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد گارڈ ڈبے میں آیا اس نے سب بتیاں بجھا دیں لیکن ڈبے کے باہر چاندنی مکمل طور پر کھل اٹھی تھی اور اس کی سپید دھم روشنی میں گاڑی کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہرے خاموش اداسی سے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

میں نے کہا "مجھے اس چاندنی میں نیند نہیں آتی۔ کھڑکی کا پردہ سرکا دوں"؟

"ذرا ٹھہرو" بوڑھے سکھ نے بہت ہی دھیمے لہجہ میں بے حد پُرسوز آواز میں کہا "یہ پونم کی رات بہت بھیانک ہے بہت خوبصورت بھی ہے مجھے اس سے ڈر لگتا ہے مگر میں اسے دیکھنا بھی چاہتا ہوں۔ کچھ دیر اور اس چاند کو دیکھ لوں"؟ چاند کو تو نوجوان لوگ دیکھتے ہیں۔ ہمارے تمہارے دیکھنے کی یہ چیز نہیں۔ میں نے افسردہ تبسم کے ساتھ کہا۔ بوڑھا سکھ مسکرایا۔ اس کا دایاں رخسار چاندنی میں تھا اور صلیب کا نشان بہت گہرا دکھائی دے رہا تھا۔ بایاں رخسار کی وی (V) تاریکی میں گم تھی۔

میں نے کہا۔ "تمہارے رخساروں کے یہ زخم کیا تم نے جنگ میں حاصل کئے ہیں"؟ جنگ؟ جنگ، بوڑھے سردار نے میری طرف دیکھ کر اپنے آپ میں گم ہوتے ہوئے کہا۔

ہاں! جنگ ہی تو تھی۔ وہ رک کر آہستہ سے بولا۔

"کون سی جنگ! پہلی جنگِ عظیم یا اس سے پہلے کی کوئی جنگ"؟ میں نے پوچھا۔

میں تو کبھی فوج میں نہیں رہا بوڑھے سکھ نے آہستہ سے کہا۔ میرا قیاس بے بنیاد ثابت ہوا اس لئے میری دلچسپی بڑھ گئی۔ میں نے پوچھا "پھر یہ زخم کیسے"؟

بوڑھے سکھ نے ادھر اُدھر دیکھا۔ چاند اپنی جگہ تھا۔ کھڑکی اپنی جگہ تھی۔ مسافر ڈبے میں خال خال ہی تھے، مگر جہاں تھے وہیں کے وہیں اپنی اپنی آرام کرسیوں پر دراز سو رہے تھے ہمارے آگے پانچ چھ سیٹیں چھوڑ کر آخر میں تاریک کونے میں وہ لڑکا اور لڑکی اپنی اپنی کرسیوں پر دبکے ہوئے تھے۔ لڑکی کا سر لڑکے کے شانے پر تھا اور لڑکے کا بازو لڑکی کے شانے پر۔ آنکھیں دونوں کی بند تھیں۔

بوڑھے سکھ نے مجھ سے پوچھا۔ یہ قصہ ضرور سنو گے؟ اگر تمہیں نیند نہ آ رہی ہو سنا دو"۔

"نیند تو مجھے اس چاندنی میں کبھی نہ آئے گی"! بوڑھے سردار نے بڑے گداز لہجے میں کہا۔ پھر اس نے اس طرح سے کہا جیسے وہ قصہ سنانے کے لئے تیار ہو چکا ہو۔ اس نے ایک لمبی سانس کھینچ کر کہا۔ "اچھا تو سن لو۔ تم میرے لئے مکمل اجنبی ہو اس لئے تمہیں سنا دینے میں کوئی ہرج نہیں"

گاڑی کی کھڑکیوں میں دوہرے شیشے لگے ہوئے تھے۔ جن کی وجہ سے گاڑی کی چھک چھک بڑے ملگجے میٹھے مدھم غنودگی سے لبریز لہجے میں اندر آتی معلوم ہوتی تھی اور گاڑی کے دونوں طرف پھیلی ہوئی سفید چاندنی میں سیاہ درخت اپنی شاخوں کو سمیٹے ہوئے، سر جھکائے ہوئے گناہگار مجرموں کی طرح کھڑے تھے۔

سردار نے کونے میں سوئے ہوئے سراٹھے نوجوانوں کی طرف

اشارہ کرکے کہا "جوانی میں میں بھی اسی طرح تھا بے فکرا اور لاپروا اور خودسر میرا باپ گجندر سنگھ موضع حاصلان کا نمبردار تھا اور اس کے علاوہ چک نمبر ۳۷ بھی پورے کا پورا ہماری ملکیت میں تھا۔ گھر میں کھانے پینے کی کوئی کمی نہ تھی۔ گو باپ نے مجھے بی۔ اے پاس کرایا تھا۔ لیکن مجھے شروع ہی سے کھیتوں میں کام کرنے کا شوق تھا۔ قلم کی بجائے میرے ہاتھ درانتی چلانے میں مشاق تھے۔ جانے میں نے بی اے کیسے کرلیا۔ میرے باپ کی آرزو تھی کہ میں فوج میں بھرتی ہو جاؤں۔ کرنیل بنوں۔ مگر مجھے کھیتوں کی زندگی ہی پسند تھی بھوری بھوری مٹی کی سوندھی مہک، شبنم میں ڈوبے ہوئے ہرے ہرے چنوں کا بوٹ، دور دھواں کے ٹیلے پر پانی بھرتی ہوئی ناریوں کی قطار اور میری سنہری گھوڑی کی دلکی چال۔ کچے راستوں پر ہلکی ہلکی دھول جگاتی ہوئی ..... آہ!"

میں نے کہا "تم اپنے شباب میں بے حد حسین رہے ہوگے۔ عورتیں تم پر بہت مرتی ہوں گی"۔

بوڑھے سکھ نے جس مسکراہٹ سے کہا "ایسا تو مجھے کچھ یاد نہیں کہ کسی نے مجھ سے محبت کی ہو۔ ہاں میں نے ضرور ایک لڑکی سے محبت کی تھی"۔

"کون تھی وہ؟"

"میری بیوی تھی"!

"بیوی؟"

"جب میں بی۔ اے پاس کرکے گاؤں واپس آیا تو میرے باپ نے چک جھمراں کے نمبردار کی لڑکی پریتو سے میرا بیاہ کردیا۔ پریتو بڑی خوبصورت لڑکی تھی۔ لانبی اور بانکی۔ گوری اور سنہری لچلچی اور نرم

ترتیب

		صفحہ
۱ - اپنے دُکھ مجھے دیدو	راجندر سنگھ بیدی	۱۱
۲ - پرتیو	کرشن چندر	۴۰
۳ - ٹوٹے پل	علی عباس حسینی	۴۸
۴ - ماتم	احمد ندیم قاسمی	۵۸
۵ - پھرتے ہیں میر خوار....	شوکت صدیقی	۶۳
۶ - زہر	عصمت چغتائی	۸۲
۷ - پاندان	واجدہ تبسم	۹۱
۸ - ایمان کی سلامتی	جیلانی بانو	۱۱۳
۹ - چابی	بانو قدسیہ	۱۲۱
۱۰ - نیلی آنکھیں	پریم ناتھ در	۱۲۵
۱۱ - بجھتے چراغ	رام لعل	۱۲۹

جیسے کوارگنڈل مگر میں تو اس کی آنکھوں پر مرتا تھا۔"

"کیوں اُن آنکھوں میں کیا بات تھی"؟ میں نے پوچھا۔

"بظاہر تو کوئی خاص بات تھی بڑی بڑی تھیں اور کالی سیاہ"! مگر ایسی تو بہت سی عورتوں کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ پھر بات کیا تھی"؟

"کہہ نہیں سکتا۔ ان آنکھوں کا رنگ، نہیں نہیں رنگ نہیں، ان آنکھوں کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔"

"وہ آنکھیں بولتی تھیں"؟

"بولتی تو نہیں تھیں لیکن بولنا چاہتی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہیں گی مگر وہ مجھ سے کچھ نہ کہتیں۔ ہر وقت سپنے سے دیکھتی رہتیں۔ کبھی ایسی آنکھیں تم نے دیکھی ہیں جو ہمیشہ سپنا سا دیکھا کریں؟"

"جوانی میں سبھی آنکھیں سپنے دیکھتی ہیں" میں نے کہا، "ہاں۔ لیکن سپنے ہر ایک کے الگ الگ ہوتے ہیں"!

"بڈھے نے آہستہ سے کہا۔ میں تو اپنی پریتو پر مرمٹا تھا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ یہ اس لئے ہوا کہ میری زندگی میں اس سے پہلے کوئی عورت نہ آئی تھی۔ نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد....."

"پریتو تم نے نہیں دیکھی، ورنہ یوں نہ کہتے۔ وہ تو ایسی عورت تھی جس سے اس کے بیوی ہونے کے بعد بھی اس سے عشق کیا جاسکتا تھا۔"

اور پھر یوں ہی ہوا۔ جب میں گاؤں پہنچا اور میں نے فوج میں بھرتی ہونے سے کسان بننے کو ترجیح دی تو میرے باپ نے فوراً میرا بیاہ کردیا اور مجھے کھیتوں پر کام کرنے کو لگا دیا۔ حالانکہ اُسے اس بات میں بڑی مایوسی ہوئی ہوگی۔ مگر میں تو بہت خوش تھا۔ تم جانتے ہو اگر میں فوج میں ہوتا تو کیسے اپنی پریتو سے محبت کرسکتا تھا۔ اب تک تو فرنگیوں کی کسی نہ کسی لڑائی میں، اٹلی میں، فرانس میں یا میسوپٹیمیا میں،

یا درّہ خیبر میں کہیں نہ کہیں ان لوگوں نے میری جان لے لی ہوتی۔ حالانکہ میں نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ ہوا اچھا ہوا یا بُرا ہوا۔

یکایک وہ چُپ ہو گیا۔

میں بھی چُپ رہا۔

بہت دیر کے بعد وہ بولا۔ قصّہ مختصر یہ کہ میں اپنی پریتو کو بہت چاہتا تھا اور وہ بھی مجھے بہت چاہتی تھی اور ہم کبھی ایک دن کے لئے بھی ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوتے تھے۔ لیکن ہماری شادی کے چھ ماہ بعد کیا ہوا کہ میرا سسرا اپنے گاؤں میں سخت بیمار پڑا اور پریتو کو اپنے میکے جانا پڑا۔ اس کا باپ بیمار تھا۔ اس لئے میں بھی اسے کیسے روک سکتا تھا۔ چنانچہ پریتو چلی گئی۔ لیکن اس کے جانے کے بعد میرا دل اپنے گھر میں، کھیتوں میں، اپنی گھوڑ سواری میں، کسی کام میں نہ لگتا تھا۔ تین دن تو میں نے جیسے تیسے کر کے کاٹے۔ لیکن چوتھے دن میں نے اپنی گھوڑی پر زین کسی اور سرپٹ ہو لیا۔ اپنی سسرال چک جھمراں ہمارے گاؤں سے تیس کوس پر واقع ہے۔ لیکن میری گھوڑی بڑی تیز رفتار ہے میں شام ہوتے ہوتے چک جھمراں پہنچ گیا۔ وہاں جا کے معلوم ہوا کہ میرے سسر کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہے بلکہ میں نے اُسے خاصا ہشاش بشاش پایا۔ ساس اور سسر دونوں مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ داماد اپنے سسر کی صحت پوچھنے چلا آیا ہے تو وہ میری سعادت مندی پر بہت خوش ہوئے دن بھر تیس کوس کا سفر کرنے سے میں بہت تھک گیا تھا۔ اس لئے جلدی کھانا کھا کے میں سو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب جو سوؤں گا تو پھر صبح ہی اُٹھوں گا۔ میں نے پریتو سے کہا۔ مجھے صبح ضرور اُٹھا دینا میں گھوڑی پہ سوار ہو کر صبح سیر کو جاؤں گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دن

چڑھے تک سوتا ہی رہوں۔

لیکن ہوا یہ کہ اس رات تیسرے پہر ہی میری آنکھ کھل گئی اور میں یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ میری بیوی میرے بستر پر نہیں ہے۔ دور کمرے کے آخری سرے پر دروازے کے ہلکے سے کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ اور ایک سایہ سا دروازے کے باہر گذرتا ہوا معلوم ہوا۔ میں آنکھیں مل کر اُٹھ بیٹھا۔ واہگورو یہ کیا ماجرا ہے؟ سوچ سوچ کر میں آہستہ سے اپنے بستر سے اٹھا۔ کرپان کو تکیئے کے نیچے سے نکال کر پہنا اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر ہو لیا۔

باہر ایسی ہی چاندنی رات تھی۔ بڑی خوبصورت خوشبوؤں والی چاندنی رات تھی۔ سرس اور شیشم کی شاخوں میں چھپے ہوئے گھونسلوں میں کبھی کبھی چڑیاں غنودگی میں چوں چوں کرتیں گران کے چڑے فوراً اپنی مضبوط چونچ سے ٹھونگ کر انھیں اپنی گود میں دبا لیتے۔ میرے پاؤں شبنم میں بھیگ چکے تھے اور میرے چاروں طرف سرسوں کی ہری ہری کونپلیں لہرا رہی تھیں اور کھیتوں میں گزرتا ہوا اپنی پرتیو کے تعاقب میں جا رہا تھا۔

پہلے میں نے یہ سوچا وہ کھیتوں میں ضروری حوائج سے فارغ ہونے جا رہی ہے۔ لیکن جب اس نے ایک کھیت کو پار کر لیا۔ دوسرے کھیت کو پار کر لیا۔ تیسرے کھیت کی ڈھلوان سے گھوم نیچے کے خشک نالے کو پار کر کے ٹیلوں کے پیچھے غائب ہو گئی تو مجھے کچھ عجیب طرح کی تشویش، حیرت اور کوفت سی ہونے لگی۔ دل کو دھچکا سا لگا اور اب میں ہولے ہولے بہت ہی احتیاط سے اس کے تعاقب میں چلنے لگا تاکہ اُسے پتہ نہ چلے کہ کوئی اس کے تعاقب میں ہے، تیسرے کھیت کی ڈھلوان سے اتر کر نالے کو پار کیا۔ پھر احتیاط سے ٹیلوں کے پیچھے سے گھوم کر میں نے آگے کو نظر دوڑائی۔

سامنے پھر سرسوں کے کھیت تھے۔ کھیتوں کے بیچ میں ایک کنواں تھا۔

کنوئیں کے قریب بیریوں کا ایک سائے دار جھاڑ تھا۔ جھاڑ کے نزدیک ایک پلنگ بچھا تھا۔ پلنگ کے قریب ایک ناپختہ گھر تھا جس کا دروازہ آدھا کھلا تھا۔

اور میری بیوی اس پلنگ پر ایک جاٹ کے ساتھ سو رہی تھی۔ میری پریتو۔ میری بیوی۔ اس سے بہت پیار کر رہی تھی۔ وہ بار بار اس کی آنکھیں چومتی اور اس کے رخسار اور کتنی شدت تھی اس پیار میں۔ میری آنکھوں میں خون اُترنے لگا۔ مگر میں چھپکا بیریوں کے جھاڑ کے پیچھے کھڑا ان لوگوں کو پیار کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ہاں۔ ہاں! اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا۔

کچھ عرصے کے بعد جاٹ نے میری بیوی سے کہا۔ پریتو! مجھے پیاس لگی ہے اندر سے پانی لادے۔

پریتو نے اپنا سر اس کے سینے سے ہٹا لیا اور بولی بچنے! تیری پیاس کیا ابھی تک نہیں بجھی؟

بچنا جواب میں صرف مسکرا دیا اس نے میری بیوی کے ہونٹ چوم لئے۔ پریتو آہستہ سے پلنگ سے اُٹھی اور ادھ کھلے دروازے سے ناپختہ مکان کے اندر گئی۔ بچنا اوندھے منہ لیٹ کر بڑے اشتیاق سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ کیونکہ میری بیوی بالکل ننگی تھی۔

یکایک میں نے کرپان نکالی اور اسے اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر سر کو اوپر اٹھایا اور پھر اپنی پوری طاقت سے بچنے پر وار کیا۔ بچنے کے منہ سے "ھک" کی ایک ہلکی سی آواز نکلی۔ دوسرے لمحے میں اس کا سر قلم ہو گیا۔ پھر میں بیریوں کے جھاڑ کے پیچھے سے کھیتوں میں غائب ہو گیا۔ ٹیلوں کے پیچھے سے نالے کو عبور کر کے سرسوں کے کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے میں نے چند لمحوں کے لئے رک کر اپنی کرپان کو مٹی سے اچھی طرح صاف کیا اور جب وہ بالکل صاف شفاف ہو کر آئینہ کی طرح چمکنے لگی تو اُسے میان میں رکھ کر

گھر کے اندر آ گیا اور کمرے کے اندر آ کر پھر اپنے بستر پر سو گیا۔

کوئی آدھ پون گھنٹے کے بعد پرتیو میرے گھر میں دھیرے سے داخل ہوئی میں جاگ رہا تھا لیکن میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور لمبے لمبے سانس لینے لگا پرتیو نے دروازہ کھول کر پہلے تو مجھے غور سے دیکھا پھر اس نے آہستہ سے میرے تکیئے کے نیچے سے کرپان نکالی اور اسے کھول کر دیکھا اور جب اسے بالکل صاف پایا تو گویا اس کے دل کا شبہہ دور ہو گیا اور وہ میری بغل میں آ کر لیٹ گئی۔ چپ چاپ پتھر کی سل! بوڑھا سکھ چپ ہو گیا۔

چند لمحوں کے انتظار کے بعد میں نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔ پھر کیا ہوا۔ کچھ نہیں ہوا؟ اس کا باپ چونکہ صحت یاب ہو چکا تھا اس لئے میں پرتیو کو لے کر دوسرے دن ہی اپنے گاؤں چلا آیا اور ہم دونوں ہنسی خوشی اکٹھے رہنے لگے۔

دن بیتے، مہینے بیتے، سال بیتے، میں نے کبھی اس بات کا اس سے تذکرہ نہیں کیا نہ پرتیو نے کبھی کسی بات سے مجھ پر یہ ظاہر ہونے دیا کہ اسے کسی بات کا بھی شبہ ہوا تھا یا اسے کسی بات کا کوئی غم تھا۔ ہاں ایک بات میں نے ضرور دیکھی اس واقعہ کے بعد وہ پھر کبھی اپنے میکے نہیں گئی۔ میرے کہنے پر یا اپنے باپ کے اصرار پر بھی نہیں گئی۔ ہوتے ہوتے میں بھی اس واقعہ کو بھول سا گیا۔ کیونکہ اب میرے بچے ہو گئے تھے۔ میرے اور پرتیو کے بچے، دو لڑکے اور ایک لڑکی۔ بڑے خوبصورت بچے تھے ہمارے پرتاپ اور دلیپ اور ہرنام کور بڑھتے بڑھتے بچے بھی بڑے ہو گئے اور اسکول جانے لگے، اسکول سے کالج میں جانے لگے تو ہمارے ہاں تیسرا لڑکا پیدا ہوا۔ ہربنس سنگھ۔ اب ہمارے گھر میں شادمانی اور مسرت تھی آرام و سکون، خوشی اور یقین، گہری رفاقت اور مفاہمت جو اچھے گھروں کی مثال بنتی ہے۔

ایک روز میں شام کے وقت کھیتوں سے واپس آ کر گھر کے نیچے بیٹھا ہوا تھا پرتاپ اور دلیپ کالج سے واپس آ گئے تھے۔ گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لئے ہرنام ایک کونے میں کشیدہ کاڑھ رہی تھی۔ میرا سات سال کا ہربنس لکڑی کے گھوڑے کو

چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پریتو مگھ کے نیچے ایک کونے میں چولھے میں مکئی کی روٹیاں سینک رہی تھی ہانڈی میں سرسوں کا ساگ ابل رہا تھا اور اس کی کٹ کھنی خوشبو میری بھوک اور بھی بے چین کر رہی تھی۔ میں نے جلدی سے کریان کھول کر الگ رکھ دی، اور ہاتھ منھ دھو کر پریتو کے سامنے مونڈھا بچھا کر بیٹھ گیا اور بالکل بچّوں کی طرح بے چین ہو کر اس سے کھانا مانگنے لگا۔

پریتو جلدی سے کھانا دے دے!

پریتو نے سب سے پہلے میرے لئے کھانا پروسا۔ پھر پرتاپ کے لئے، پھر دلیپ کے لئے، پھر ہرنام کور کے لئے۔ سب سے چھوٹے ہربنس نے مچل کر کہا "میں تو اماں کے ساتھ کھانا کھاؤں گا۔"

میں نے پریتو سے کہا تو بھی بیٹھ جا اب!

میں بیٹھ جاؤں گی تو تمہیں کھانا کون کھلائیگا۔ پریتو نے ذرا ناک سکیڑ کر کہا۔

اس وقت چولھے کی روشنی میں اس کے رخسار تمتما اٹھے تھے اور الجھی ہوئی زلف ماتھے پر اتر آئی تھی۔ مجھے وہ اس وقت بہت اچھی لگ رہی تھی۔

ماں! مجھے سرسوں کا ساگ اور دینا۔ دلیپ نے اپنی تھالی بڑھاتے ہوئے کہا۔

پریتو نے ہانڈی میں سے ساگ کی کرچھی بھر کر اسے دلیپ کی تھالی میں انڈیل دیا۔

میں نے کہا۔ "ہربنس کی ماں! تھوڑا سا اچار اگر اس وقت کہیں سے مل جائے تو کھانے کا مزا دونا ہو جائے۔"

"اچار تو اندر کوٹھری میں ہے"! پریتو نے رک رک کر کہا۔

تو کیا ہوا۔ اندر سے جا کے لا دے۔

پریتو سہم کر بولی اکیلی کیسے جاؤں؟ اندر تو بڑا اندھیرا ہے مجھے ڈر لگتا ہے۔

ڈر لگتا ہے؟ یکایک میرے منھ سے بے اختیار نکلا۔ اس وقت سب کے سامنے اندر جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے لیکن اُس رات کو کھیتوں کو پار کر کے اکیلی جانے میں ڈر نہیں لگا تھا؟ یکایک میں نے تنک کر کہا، جانے کیسے کہہ دیا۔

اتنے سالوں تک جس بات کو کبھی نہ کہا تھا کیسے وہ بات یوں ایک طعنہ بن کر اتنے سالوں کے بعد میرے ہونٹوں پر آ گئی۔

پرتیو نے بیٹھے بیٹھے بس ایک لمحے کے لئے مجھے دیکھا۔ دوسرے لمحے میں مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کرپان لئے میرے سر پر کھڑی ہے۔ پھر ایک بجلی سی تڑپی اور میں نے اپنے آپ کو بچانے کے لئے ہاتھ اوپر اٹھائے۔

ایک بار دو بار، تین بار کرپان میرے رخساروں کو کاٹتی ہوئی چلی گئی۔ میں نے اپنے بچاؤ کے لئے اپنے ہاتھوں سے اسے روکنا چاہا اور چلایا۔ پرتیو، پرتیو! رُک جا۔ مگر پرتیو ایک بھوکی شیرنی کی طرح مجھ پر وار کرتی رہی۔ آخر غصہ میں بھر کر میں نے ایک جھٹکے سے کرپان اس کے ہاتھ سے چھین لی اور دونوں ہاتھوں سے کرپان کو اٹھا کر اور اپنے جسم اور روح کی پوری طاقت سے پرتیو کی گردن پر بھرپور وار کر دیا۔ پرتیو کی گردن کٹ کر ہربنس کے گھوڑے کے قدموں میں جا گری اور وہاں سے لڑھک کر میری تھالی میں اوندھی ہو گئی اور اس کے سیاہ بال کھل کر میرے سامنے بکھر گئے۔"

بوڑھا سکھ چپ ہو گیا۔

میں بھی چپ رہا۔ کھڑکی میں چاند بھی ایک وحشت ناک بھوت کی طرح خاموش کھڑا تھا۔ گاڑی کے مسافروں کے چہرے سپید اور سنے ہوئے تھے جیسے وہ چہرے نہ ہوں بہروپیوں کے خول ہوں۔ گاڑی کھیتوں میں سے گزرتی ہوئی نامعلوم منزل کی طرف بڑھتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ اور چاند۔ مجبور اور بے کس نہتا اور اکیلا کھڑکی میں کھڑا تھا۔

بہت دیر کی خاموشی کے بعد بوڑھے سکھ نے دلگیر لہجے میں کہا۔

عورت کبھی نہیں بھولتی! وہ لوگ عورت کو نہیں جانتے جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اسے ایک ڈولی میں سوار کرا کے، ایک پلنگ پر لٹا کر، چار بچے پیدا کر کے اس کے دل کا سپنا اس سے چھین سکتے ہیں۔ وہ لوگ عورت کو نہیں جانتے۔

عورت کبھی نہیں بولتی!

بوڑھا سکھ خاموش ہو گیا۔ اس نے اپنے رخسار کی صلیب پر آہستہ سے ہاتھ پھیرا اور خاموش ہو گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ صلیب بہت گہری اس کے دل کے اندر ڈوب چکی ہے!

گاڑی میں اس قدر سناٹا تھا کہ مجھے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی میں نے منہ کھول کر دو تین لمبے لمبے سانس اندر کو لئے پھر اچانک میری نظر کونے میں سوئے ہوئے جوڑے پر پڑی۔ لڑکی کا ہاتھ ابھی تک لڑکے کے ہاتھ میں تھا اور لڑکے کا بازو ابھی تک لڑکی کے شانے پر تھا اور دونوں کی آنکھیں بند تھیں اور دونوں سو رہے تھے۔ یکایک لڑکی نے لڑکے کے شانے سے سر اٹھایا۔ آہستہ سے اپنا ہاتھ لڑکے کے نیچے سے نکالا اور لڑکے کی طرف دیکھا اور جب اسے اطمینان ہو گیا کہ لڑکا گہری نیند سو رہا ہے تو لڑکی نے نوجوان کا بازو اپنے شانے سے الگ کیا اور اس سے منہ پھیر کر چاند کی طرف دیکھا پھر ایسی حسرت آمیز نگاہ سے دیکھا جو اس کی گلنار مسکراہٹ کی ہر قدم پر تکذیب کرتی تھی۔ میں بالکل بھونچکا رہ گیا یکایک میرے ذہن میں ایک کرپان سی لہلہاتی محسوس ہوئی اور میں نے ڈر کر آنکھیں نیچی کر لیں۔

دوسرے لمحے میں جب میں نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو لڑکی نے اپنی کھڑکی پر پردہ گرا لیا تھا۔ اس کا چہرہ اندھیرے میں تھا۔ گو میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکتا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ رو رہی ہے۔

ٹوٹے پل

امرداداان تینوں درختوں پر جان دیتے تھے۔ لوگ کہتے کہ وہ انھیں اپنی اولاد سے زیادہ چاہتے تھے۔ ان کے لئے وہ پیڑ نہ تھے بلکہ ان کے بزرگوں کی روحیں تھیں اور تھے بھی وہ درخت خاندانی۔ املی کا پیڑ ان کے دادا نے لگایا تھا۔ نیم کا درخت ان کے پتاجی نے اور آم کا مولا تو خود انھوں نے بھوشن کی پیدائش کے دن اپنے ہاتھوں سے گھر کے صحن میں بٹھایا تھا۔ تینوں درختوں کے پھلوں کا ذائقہ بھی روائتی تھا۔ املی کی ترشی بڑے بڑوں کے دانت کھٹے کر دیتی تھی۔ نمکولیاں اپنے کڑوے پن میں چرائتے کو مات کر دیتی تھیں اور آم کی کھٹاس کے سامنے لیمو کا اچار بھی پانی بھرتا تھا۔ پھر بھی امرداداان درختوں پر فدا تھے۔ جان چھڑکتے تھے۔ ہر روز صبح سویرے جب وہ اشنان کر کے سورج دیوتا کو جل چڑھاتے، تو ان درختوں کے تھالوں میں بھی پانی دیتے نہ سورج کی پوجا ناغہ ہوتی اور نہ درختوں کی رکھوالی۔

بوڑھا ہو کہ بالا۔ وہ کسی کو ان درختوں پر چڑھنے نہ دیتے۔ ان کی ایک پتی چھونے نہ دیتے۔ دتو مین ان کے درخت سے دستیاب نہ ہو سکتی تھیں۔ لاکھ حکیم جی "برگ نیم کوفتہ و بیختہ" کر کے زخموں پر ٹکیاں بنا کر رکھنے کو کہیں، یہ مرہم دادا کے پیڑ سے نہ حاصل کیا جا سکتا۔ املی کی کچی پھلی یا آم کی کیری پر ڈھیلا مارنا خود ان پر سنگ ساری کے برابر تھا۔ نمکولیاں زمین پر پڑی سڑتی رہیں۔ لیکن جب تک دادا کا حکم نہ ہو کوئی چمارن اُن سے تیل نکالنے اور اپنی اندھیری جھونپڑی میں دیا جلانے کی غرض سے انھیں بٹورنے کی ہمت نہ کر سکتی تھی۔ البتہ جب املی پکنے لگتی اور آم کے پھل پورے رس پر آجاتے تو دادا خود ان درختوں پر چڑھتے اور اپنے ہاتھ سے ان کے پھل پھیلوں اور جالیوں میں

توڑ کر ڈھیر لگاتے تھے۔ اس وقت گاؤں کے سارے لڑکے اور لڑکیوں کو اجازت تھی کہ وہ دادا کا اس کام میں ہاتھ بٹائیں۔ جب درختوں کی ایک ایک پور سے گھنا اتار لیا جاتا تو پھلوں کا پورا ڈھیر گاؤں بھر میں بانٹا جاتا۔ اگر کسی گھر کا نمائندہ بچہ نہ ہوتا تو امرداد ان درختوں کے پھل وہاں خود پہنچا دیتے۔ پورے گاؤں میں سوائے جگن بہو کے کوئی گھر نہ بچتا جہاں امرداد کے کھٹے آم املی کی مٹھاس بڑھانے کا شیریں فرض ادا نہ کرتے تھے۔

رہی جگن بہو تو وہ اس کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ جگن بہو سے یہ جلن اس کی لڑکی لجیا کی ہم عمر تھی، ٹھیک دن تاریخ تو نہیں بتائی جا سکتی لیکن ۱۹۴۲ء کی فروری میں لجیا نے پہلی بار گاؤں کی فضا میں آنکھ جھپکائی تھی اور "کے ہاں، کے ہاں" کر کے فریاد کی تھی اور مارچ کا مہینہ اچھی طرح جوان بھی نہیں ہوا تھا کہ گاؤں میں چیچک کی وبا پھیلی تھی جہاں بیس کے قریب بچے اور جوان "سورگباش" ہوئے وہاں ننھی لجیا کے باپ کو بھی "ماتا مائی لے گئیں" امرداد اگاؤں بھر کے مریضوں کی دیکھ بھال کرتے رہتے تھے، ان کے دونوں لڑکے بھوشن اور مہندر شہر میں تھے، بیوی پہلے ہی مر چکی تھیں انھیں اپنی کوئی فکر نہ تھی ان کو ایک بار بڑی چیچک بھی نکل چکی تھی۔ وہ نڈری سے سب کی سیوا کرتے تھے۔ جگن جو مر گیا تو انھوں نے اس کی بیوہ کو خاص طور پر سہارا دیا۔ کچھ دنوں تو وہ اس کے گھر کھانے پینے کی چیزیں پہنچاتے رہے پھر اس نے انھیں کے گھر آنا شروع کیا اور "رسوئی گھر" کا کام سنبھال لیا۔

دونوں ایک ہی ذات کے ضرور تھے، مگر دو جنسوں کے تھے۔ عمروں میں بڑا فرق تھا۔ یہ تقریباً چالیس سال کے "گرگ باراں دیدہ" اور وہ صرف سترہ برساتیں دیکھے ہوئے۔ دادا کی صورت میں کوئی کشش نہ تھی۔ ساڑھے پانچ فٹ کا قد، رنگ خالص تانبے جیسا، پھر چہرے پر وہ خشکی جس نے اپنے سے بڑے عمر والوں کا بھی دادا بنا دیا تھا۔ اُدھر لاکھ بھی بیوہ سہی پھر بھی جوان تھی۔ اور جوانی خود ہی حسن ہے۔ حسب دستور گاؤں کی بڑی بوڑھیوں نے ایک دوسرے کے

پیش لفظ

۱۹۳۶ء کی بات ہے اُردو میں نیا ادب ابھی کمسنی کی منزل میں تھا ادب کی مختلف اصناف میں طرح طرح کے تجربے ہو رہے تھے۔ جدت یا جدیت کی خاطر اس وقت جس نوع کے افسانے لکھے جا رہے تھے اس کے بعض پہلو مضحکہ خیز بھی تھے بقول انتظار حسین چاہے وہ منٹو ہوں یا کرشن چندر دونوں کے یہاں کچھ اس طرح کی ذہنیت تھی کہ "محبوبہ کے رخسار کو گلاب کے پھول سے کیوں تشبیہ دیں بندریا کے پیٹ سے کیوں نہ دیں" گویا اس وقت ہمارا افسانہ نگار ناول زندگی کو کچھ غیر افسانوی سی چیز سمجھ کر ایبنارمل زندگی اور اس کے عجیب و غریب کرداروں کو تلاش کرتا تھا اس وقت کی افسانہ نگاری پر تاثیر مرحوم نے ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان انہوں نے رکھا تھا "افسانہ نگاری کا تہیہ"۔ اس مضمون کی ابتدا یوں ہوتی تھی کہ "میں افسانہ نگار نہیں اور نہ مجھے اس فن سے دور کا واسطہ ہے لیکن آجکل جس طرح کے افسانے لکھے جا رہے ہیں انہیں دیکھکر بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اب میں بھی افسانہ نگاری شروع کر دوں"۔ جن لوگوں نے جدید اُردو افسانے کا بالاستعیاب مطالعہ کیا ہے ان سے یہ بات کہنے کی نہیں کہ بیس سال میں اُردو افسانہ وہاں پہنچ گیا ہے کہ اگر تاثیر مرحوم زندہ ہوتے تو انھیں افسانہ نگاری کا تہیہ کرنے کی ضرورت نہ پڑتی اور اگر تہیہ کرتے تو بالآخر انھیں بھی کچھ اس قسم کا اعتراف کرنا پڑتا جو ایک بار ڈپٹی نذیر احمد نے کیا تھا یعنی ؎

تم اپنی نثر کو لو نظم کو چھوڑو نذیر احمد
کہ اس کیواسطے موزوں ہیں حالی اور نعمانی

کانوں میں کڑوی کسیلی باتیں کہنا شروع کیں، اور دادا کے ایک ہمسن نے خود ان کے منہ پر ایک گرم گرم فقرہ کسا۔ امرداد ا جھلا کے بولے "تم لوگ کتنے بُرے ہو وہ تو میری بیٹری۔۔ ۔۔۔۔۔" مگر وہ بیٹری کے آگے کچھ نہ کہہ سکے۔ جیسے کسی نے ان کی زبان پکڑ لی ہو۔ جیسے بات حلق میں اٹک کر رہ گئی ہو اور اسی سکوت نے جگن بہو اور ان کے تعلقات میں ایک گہرائی پیدا کر دی۔ ایک مضبوط کڑی بڑھا دی۔ اس لئے کہ قانون فطرت ہے کہ جب مختلف جنسوں کی دو آزاد شخصیتیں برابر چپ سادھے ملتی رہتی ہیں تو ان کی یگانگی دن بدن بڑھتی ہی جاتی ہے۔ بھوبھل میں دبی ہوئی آگ کی طرح محبت بھی سلگتی ہی رہتی ہے۔ یہاں بھی محسن و احسان مند کے رشتے میں لگاؤ کی گرہ پڑ گئی۔

پھر بھی بات لبوں تک نہ آئی تھی اور معاملات گومگو کی حالت ہی میں تھے کہ منوہر اور بھوشن اپنے اپنے امتحان دے کر واپس آ گئے۔ منوہر کوئی پندرہ برس کا تھا۔ اب کے نواں پاس کر کے دسویں میں پہنچا تھا۔ اس نے اپنی پرانی "بھوجی" جگن بہو کو رسوئی گھر کی مالکن پایا اور جس کے ہاتھ میں ڈوئی اس کا سب کوئی" سے زیادہ دلچسپی نہ لی مگر بھوشن جوان تھا۔ اکیسویں میں قدم رکھ چکا تھا بی اے کے آخری سال میں تھا۔ یونی ورسٹی میں یونین کا سرگرم رکن تھا۔ سترہ برس کی بیوہ اور اس میں ہمسنی کا رشتہ تھا، دونوں جلد ہی ایک دوسرے سے گھل مل گئے۔ بے تکلفی سے باتیں ہونے لگیں۔ انگریز سے نفرت، رومان سے زیادہ دلچسپ موضوع تھا "دلی چلو" کا نعرہ جنس سے زیادہ خون میں گرمی پیدا کرتا تھا وہ گاؤں کے ہر جوان مرد و عورت کی طرح چپکے چپکے سازشیں کرنے لگے اسکیمیں بنانے لگے۔ مگر ایک دن امرداد انے ان کو کھِل کھلاتے ہنستے دیکھ لیا اور آگ بگولا ہو گئے۔ وہ ہنس رہے تھے کسی اور وجہ سے وہ سمجھے کچھ اور۔ بھوشن تو ان کا لال چہرہ دیکھتے ہی کھسک گیا۔ مگر جگن بہو رسوئی گھر ہی میں کھڑی رہی دادا نے دہلیز پر قدم رکھ کر اس کو اتنی صلواتیں سُنائیں کہ وہ جل بھُن کر کباب ہو گئی۔ اس نے جھپٹ کر ترکاری کاٹنے والا چاقو اٹھا لیا۔ جب وہ اس کے تیور سے کچھ گھبرا کر، کچھ ڈر کر رسوئی گھر سے باہر نکلنے لگے تو جگن بہو نے پاس والی دیوار پر چاقو اس زور سے کھینچ مارا کہ وہ دیوار میں نصف کے

قریب در آیا اور اسی کی طرح کانپنے لگا۔ دادا نے کچھ اور سہم کر اس کو دیکھا اور ان کی چال میں کچھ اور تیزی آگئی مگر جگن بہو کی اس فرار سے تسکین نہ ہوئی وہ چولھے پر کچی پکی ہانڈی چھوڑ چھاڑ، لجیا کو گود میں اٹھا روتی، بلبلاتی گھر چل دی۔ اس دن کا دن اور آج کا دن کہ امرداد نے آنکھ بھر کے اس کی صورت نہ دیکھی تھی انھیں برابر یہی محسوس ہوتا رہا کہ چاقو دیوار کی جگہ ان کے سینے میں ترازو ہے۔

صرف ایک بار دونوں کا آمنا سامنا ہوا اور وہ بھی اس طرح کے حادثے کے سلسلے میں جس نے ان کے دل کو ہمیشہ کے لئے اس عداوت اور نفرت سے بھر دیا۔ اسی ۱۹۴۲ء کی اگست میں جب یو پی کے مشرقی اضلاع بلیا، غازی پور، اعظم گڑھ کے نوجوانوں میں انگریزی حکومت کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ رہی تھی اور مادر وطن کے دیوانے لاٹھیوں اور ڈھیلوں سے بندوقوں اور مشین گنوں کا مقابلہ کرنے اٹھ کھڑے ہوئے تھے امرداد کو ایک کالی اندھیری رات میں خبر ملی کہ گاؤں والے آج کاٹھ کا پل توڑنے والے ہیں یہ پل سرجو ندی پر تھا۔ سرجو کا پاٹ بہت چوڑا نہ تھا۔ لیکن سڑک کی اغل بغل دس میل کے حلقے میں وہ کہیں پایاب اور قابل عبور نہ تھی شہر سے جو آس پاس کے گاؤں کو سڑک جاتی تھی وہ اسی پل سے ہو کر گزرتی تھی۔ اس لئے اگر پل توڑ دیا گیا تو حکومت کے آدمی اس پار والے بیس گاؤں تک آسانی سے نہ پہنچ سکتے تھے۔ انگریزوں سے آزادی چھیننے والے سورماؤں نے اسی لئے اس رشتے کو کاٹ دینے کی ٹھانی تھی۔ چند ہی دنوں کی آزادی سہی، مگر ہمتیں تو بڑھ جائینگی دوسروں کے لئے راستہ تو کھل جائے گا۔ منزل کی ایک جھلک تو دکھائی دیگی۔ جانوں کی بھینٹ چڑھا کر ہی آزادی کی دیوی کے درشن ہو سکتے ہیں۔

امرداد کو یہ لڑائی بھڑائی والی باتیں پسند نہ تھیں۔ سب جانتے تھے کہ وہ اہنسا کے پجاری ہیں وہ گاندھی جی کے چیلے ہیں۔ اس لئے کسی نے ان کو اس سازش کی کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ وہ تو اتفاقاً انھیں اس وقت پتہ چل گیا جب سب پل کی طرف جا چکے تھے اور وہ نہ لوگوں کو اکٹھا کر سکتے تھے، نہ سمجھا

بجھا سکتے تھے۔ مینھ پڑ رہا تھا، کالی اندھیری رات تھی۔ گاؤں میں عجیب طرح کا سناٹا تھا اور فضا اس قدر بوجھل تھی جیسے کہ وہ کسی کا ماتم کر رہی ہو۔ دادا اپنی بے بسی محسوس کرکے اپنے دالان میں ٹہلنے لگے۔ ہائے ان موردکھوں نے کیا بیوقوفی کی۔ اتنی جابر حکومت سے کہیں اس طرح لڑا جاتا ہے۔ سوائے خون خرابے کے اور کیا ہاتھ آئے گا؟ اس پریشانی میں بس اتنا اطمینان تھا کہ خود ان کے دونوں بیٹے بھوشن اور منوہر شہر میں تھے وہ اس اہنسا میں شریک نہ تھے۔ گاؤں والوں پر آفت آئے گی اس سے وہ یقینی بچے رہیں گے۔ انھوں نے جھک کر لالٹین اٹھالی۔ اس کی لو بڑھا کر پانی کا اندازہ کیا۔ تاریکی کے پس منظر میں گرتا ہوا موسلا دھار پانی روشنی میں ایسا معلوم ہوا جیسے یم دیوتا سرمئی تاش بادلے کا لبادہ اوڑھے سامنے کھڑے ہیں۔ ان کا دل عجیب طرح کے خوف سے دھڑکنے لگا۔ گھبرا کر لالٹین تپائی پر رکھ دی اور پھر جلدی جلدی ٹہلنے لگے۔ دفعتاً بارش کی آواز میں ملی جلی گولیوں کی تڑاتڑ اور زخمیوں اور مرنے والوں کی چیخیں سنائی دیں۔ دادا اٹھ کھڑے ہوگئے ان کا دل بلیوں اچھلنے لگا، انھوں نے کانپتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا "جان پڑتا ہے وہاں پولیس یا فوج پہلے سے چھپی بیٹھی تھی۔ نہ جانے کتنوں کی جان گئی، کتنے گھائل ہوئے!" انھوں نے جلدی جلدی دھوتی کے پھندنے کو کمر میں کس کر لپیٹنا شروع کیا۔

ایک ہاتھ میں لالٹین، ایک میں چھتری لے کر وہ صحن میں اترے ہی تھے کہ کسی دوڑنے والے کی چاپ سنائی دی۔ ساتھ ہی کسی نے آم کے تنے سے پکار کر کہا: "دادا! دادا! بھوشن کے سینے پر گولی لگی ہے، وہ جگن بہو کے گھر میں دم توڑ رہا ہے" اور کہنے والا دوڑتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

امر دادا کے ہاتھ سے لالٹین گر پڑی اور چھتری بھی۔ وہ بے ساختہ چیختے ہوئے لپکے۔ دو ایک جگہ پھسلے اور گرے بھی، لیکن ان کے پاؤں کے نیچے کی زمین بھوشن کی سناؤنی سنتے ہی نکل چکی تھی۔ انھیں کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ وہ یونہی گرتے پڑتے بدحواس جگن بہو کے گھر پہنچے۔ اندر والی کوٹھری میں جہاں مٹی کا ایک دیا جل رہا تھا

ان کا بھوشن لہو میں لت پت ایک پلنگ پر بے سدھ پڑا تھا اور پٹی پر سر رکھے جگن بہو سسک رہی تھی۔ "اہنسا" کے پجاری امر دادا کی آنکھوں میں خون اتر آیا، انھوں نے بے قصور جگن بہو کو زور سے لات ماری۔ "ڈائن! کھالیا نہ تو نے میرے بھوشن کو!" وہ دھاڑے اور بیٹے کی گردن اور ٹانگوں میں باہیں ڈال کر اسے گھر اٹھا لائے۔

بھوشن نے ان کی گود میں تڑپ تڑپ کر تھوڑی دیر میں جان دے دی۔ وہ اسے زمین پر ڈال کر رات بھر اس کے سرہانے بُت بنے بیٹھے رہے۔ صبح کو اُٹھ کر انھوں نے سورج کے ساتھ ساتھ اپنے درختوں پر پانی چڑھایا اور پھر آکر آزادی وطن پر بھینٹ چڑھنے والے بیٹے کے پاس بیٹھ گئے۔ دن چڑھے پولیس آئی، بھوشن کی لاش کے ساتھ ساتھ انھیں بھی شہر لے گئی۔ ساری جائداد، مویشی کھیت کھلیان سب کچھ ضبط کر لیا گیا اور بوڑھے باپ کو باغی بیٹے کو مرتے وقت پناہ دینے کی سزا میں سات برس کی قید سخت کا حکم ملا۔ جب پانچ برس بعد ملک کو آزادی ملی اور دادا کو قومی حکومت نے آزاد کیا تو منوہر نے جواب لکھ کر شہر میں رہنے لکھا اپنے ساتھ قیام پر ان سے اصرار کیا۔ مگر امر دادا بیٹے کی بات سنتے یا اپنے درختوں کی پکار؟ وہ اکیلا تھا! دھرتین تین! دادا کی یادگار بھی، باپ کی بھی اور خود ان کے بھوشن کی بھی۔

وہ گاؤں آئے اور اسی پل پر سے ہو کر آئے جس کے توڑنے کے لئے بھوشن نے جان دے دی تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی ان کا جی چاہنے لگا کہ کاش یہ پل اپنے آپ ٹوٹ جاتا اور پھر کبھی نہ بنتا۔ اسی طرح نہ بنتا۔ جس طرح ان کا بنا بنایا گھر اس کے کارن بگڑ کر پھر نہ بنا اور کچھ درد سے کچھ غصّے سے کانپتے ہوئے گاؤں میں داخل ہوئے اور اپنے گاؤں کے سرے ہی پر وہ کھائی دیا وہی منحوس مکان، جگن بہو کا گھر، اور ان کا جی چاہنے لگا کہ کاش یہ مکان گر گیا ہوتا۔ ڈھے گیا ہوتا! کاش جگن بہو اپنے میاں کے ساتھ ہی مر گئی ہوتی کہ اس نے اسی شام کو بھوشن اور اس کے ساتھیوں کو پل توڑنے سے پہلے اپنے یہاں بیٹھ کر سازش کرنے کا موقع نہ دیا ہوتا۔

اور اسی جلن میں پورے اس برس گزر گئے اور آج اسی اگست کے مہینے میں

جب سارا گاؤں سات دن کی مسلسل بارش سے تباہ ہو رہا تھا انھوں نے پہلی دفعہ خوشخبری سنی۔ ندی کی باڑھ نے کاٹھ کا پل توڑ دیا۔ دادا نے خبر دینے والے رامو کا منہ خوشی سے بوکھلا کر دیکھا اور پوچھا "ارے سچ"! اور رامو کے سر ہلا کر ہامی بھرنے پر وہ اپنے دالان سے برستے ہوئے پانی میں صحن کی کیچڑ میں پھاند پڑے۔ وہ آسمان کیطرف دیکھ کر چیخے۔ "تیری لیلا ہے بھگوان!" پھر دفعتہً انھوں نے اپنی پیشانی زمین پر رکھ دی، پھر وہ یکبارگی اچھل کر کھڑے ہو گئے اور "تیری لیلا ہے بھگوان تیری مہیما ہے بھگوان!" کہہ کر آنگن میں ناچنے لگے۔ دالان میں کھڑا رامو گھبرا یا ہوا منہ کھولے انھیں دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ دادا کو کیا ہو گیا ہے کس بیماری کا دورہ پڑا ہے سات دن سے پانی ایک منٹ کے لئے نہ رکا تھا۔ گاؤں کے آدھے سے زیادہ گھر گر گئے تھے۔ نہ جلانے کے لئے لکڑی رہ گئی تھی نہ کھانے کو چاول، نہ ستو، نہ آٹا، نہ دالیں، نہ ترکاریاں۔ ہر ایک کا حال تباہ تھا۔ دن تو کسی طرح کاٹ لیا جاتا تھا لیکن راتیں حد سے زیادہ ڈراؤنی بن گئی تھیں۔ مٹی کا تیل کب کا ختم ہو چکا تھا۔ لالٹین جلائی نہ جا سکتی تھی۔ سرسوں اور نمکولیوں سے جلنے والے دیے بھی بجھے پڑے تھے۔ سانپ، بچھو، کنکھجورے ہر طرف رینگتے پھرتے تھے۔ اندھیرے میں انھیں کا راج تھا ایسے میں سکھ دیو شہر، فریاد لے کر گیا تھا۔ لے دے کے یہی آسرا تھا کہ ضلع کے حاکم جلد سے جلد مدد بھیجیں گے۔ ٹرک پہلاد کر سارا سامان جلد سے جلد پہنچائیں گے مگر اب تو پل ٹوٹ گیا تھا۔ اب گاڑیاں کیسے آئیں گی، مدد کیسے پہنچے گی۔ اب تو گاؤں کی تباہی یقینی ہو گئی تھی۔ اب تو گویا بربادی پر مہر لگ گئی تھی اور دادا ہیں کہ ہنس رہے ہیں، خوشی سے ناچ رہے ہیں، جیسے گاؤں کی تباہی اور بربادی انکی دلی مراد تھی جو بر آئی ہے۔

رامو اٹک اٹک کر کہنے لگا "کیا کرتے ہو دادا؟ کیا کرتے ہو؟ گاؤں میں کہیں لکڑی نہیں، مٹھی بھر کسی کے یہاں آٹا، چاول نہیں، لالٹین جلانے کے لئے تولہ بھر تیل نہیں شہر سے یہ سب سامان لانے سکھو گیا تھا، پر اب تو پل ہی ٹوٹ گیا.....

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

اور دادا نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ رامو نے صحن میں پھاند کر انھیں پکڑنے کی کوشش کی۔ اسے غصہ آنے لگا تھا، وہ چیخا، "چپ رہو دادا! تمہیں ہنستے شرم نہیں آتی۔ ہم سب کی تو یہ حالت ہے اور کل گاؤں میں برات آرہی ہے۔"

دادا نے رک کر پوچھا۔ "کیسی برات؟ کس کی برات؟"

"لجیا کی" رامو بولا۔

"لجیا کون!" دادا نے پوچھا۔

رامو نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "ارے وہی جگن کی پُتریا۔ آج صبح جگن بھومرتے مرتے بچی، اس کا پورا مکان بیٹھ گیا۔ وہ دونوں ہمارے گھر میں ہیں۔"

اور امرداد کے مسی رنگ کے گال ہوا سے چراغ کی لو کو گھیرا بنا کر بچانے والی ہتھیلیوں کی طرح لال ہو گئے اور ان کے منہ سے چھوٹتے ہوئے انار جیسی آواز نکلنے لگی۔ قہہ، قہہ، قہہ، قہہ، قہہ! اور وہ پھر کیچڑ اور پانی میں ناچنے، تھرکنے اور تیری لیلا ہے بھگوان! تیری مہیما ہے بھگوان!" کی رٹ لگانے لگے۔ انکی یہ آبستبازی اسی طرح چھوٹ رہی تھی کہ دفعتاً کالے بادلوں نے بھی اپنی مہتابی واعظی اور ایک تڑاخے کے ساتھ املی پر اس زور سے بجلی گری کہ رامو اور دادا منہ کے بل گرتے گرتے بچے، مگر املی کی ایک موٹی سوکھی ہوئی شاخ جڑ چرا کر زمین پر آرہی۔ اور امرداد "ہائے میری املی" کہہ کر اُدھر لپکے۔ مگر رامو نے جھپٹ کر انھیں پکڑ لیا۔ وہ چھوڑو چھوڑو! ارے میری املی جلی جاتی ہے۔" کہہ کر برابر زور مارتے رہے مگر اس نے نہ چھوڑا۔ املی میں یقینی آگ لگ جاتی۔ مگر تیز گرتے ہوئے پانی نے اسے بڑھنے نہ دیا وہ تھوڑی ہی دیر میں چھن چھن کر کے بجھ گئی۔ امرداد کا ابال بھی بیٹھ گیا۔ رامو نے ہاتھ ڈھیلے کرتے ہوئے کہا۔ "سچ کہتے ہو دادا! بھگوان کی لیلا۔ اس نے بدھوا کی پتری کے بیاہ کے لئے سوکھی لکڑی کھد (خود) توڑ کر بھیج دی!"

امرداد نے پھنکاری ماری۔ "میں لکڑی وکڑی نہیں دوں گا اس پاکھنڈی

کی پُتری کے لئے۔" رامو کچھ کہنے ہی والا تھا کہ گاؤں کے کئی گھروں سے لوگ "کیا ہوا، کیا ہوا دادا؟" چیختے ہوئے نکل پڑے۔ بجلی کی چمک، تڑاخے کی آواز اور دادا کی چیخ سے سب کو یقین ہو گیا تھا کہ دادا ہی پر بجلی گری۔ جو لوگ اس طرح دوڑ کر ان کی خیر سلا لینے آئے تھے انہی میں جگن بہو بھی تھی اس پر نظر پڑتے ہی دادا پر گویا ایک اور بجلی گری، وہ سارے جسم سے زخمی کبوتر کی طرح کانپے اور انھوں نے اُدھر سے منھ پھیر لیا۔ ویسے ہی پل کی طرف سے "رامو بھیا! رامو بھیا" سکھدیو کے پکارنے کی آواز سنائی دی۔ اور رامو "کیا ہے سکھدیو؟ کیا ہے! آتے ہیں! آتے ہیں!" چیختا اُدھر لپکا۔

چند ہی منٹ میں وہ سکھدیو کے ساتھ پلٹا۔ اکیس برس کا سکھدیو اس وقت صرف ایک جانگھیا پہنے تھا اور ایک ہاتھ میں کلہاڑی لئے وہ یوں کانپ رہا تھا، جیسے وہ بہت دور سے دوڑتا چلا آرہا ہے۔ اس نے دادا سے جلدی جلدی کہنا شروع کیا "دادا! دادا! دو بڑی بلّیاں چاہئیں دادا، دو بلّیاں! سہر سے ٹرک پر لدا سب سامان اس پار کھڑا ہے۔ پل جیادہ (زیادہ) نہیں ٹوٹا ہے۔ بس دو بلّی مل جائے سب کام بن جائے۔ آدمی بھی آئے ہیں، لوہا سمنٹ، اوجار (اوزار) بھی بس دو بلّی کا انتجام (انتظام) کر دو دادا! دو بلّی کا۔"

امرو دادا نے زچ ہو کر کہا۔ "تو ہم کیا کریں بھیا بلّی کہاں سے آوے؟"

رامو جان پر کھیل گیا۔ اس نے تاڑ جیسے لمبے آم کے پیڑ کی طرف انگلی اُٹھا دی

امرو دادا بپھر گئے "کیا کہا؟ کیا کہا؟ تمہارا مطلب ہے ہم اپنے بھوشن کا پیڑ کاٹ دیں۔ بھوشن کا آم! یہ کبھی نہ ہوگا، کبھی نہیں! کبھی نہیں!" اور لپک کر اس کے تنے کو انھوں نے اپنے جسم سے اس طرح چھپا لینے کی کوشش کی جس طرح مرغی اپنے چوزوں کو کسی آفت سے بچانے کے لئے اپنے پروں سے ڈھک لیتی ہے۔

کئی فریادی آوازیں ایک ساتھ کئی گلوں سے نکلیں۔

سکھدیو چیخا۔ "مگر دادا پُل!"

رامو نے فریاد کی۔ "ارے گاؤں؟"

اور جگن بہو سسکی ۔ "بجیا کی برات ؟"

امرداداکو نہ اس وقت کچھ دکھائی دیتا تھا، نہ سنائی دیتا تھا۔ ان کی آنکھیں بند تھیں، البتہ ان میں گزرے ہوئے تیس برسوں کی تصویریں گھوم رہی تھیں وہ بھوشن کی پیدائش کا دن، وہ ان کا خوش خوش اپنے ہاتھوں سے ممولے کا لگانا، وہ بھوشن کا اسکول، کالج سے پلٹ پلٹ کر گھر آنا اور وہ اسی پل کے توڑنے کے لئے گولی کھا کر جگن بہو کے گھر میں خون میں نہایا ہوا پڑا ہونا اور وہ ان کا اپنے لعل کو گود میں اٹھا کر اپنے مکان کی طرف چلنا۔ ایسا جان پڑتا تھا جیسے پاؤں من من بھر کے ہو گئے تھے۔ اٹھائے نہ اُٹھتے تھے اور انھیں دفعتاً محسوس ہوا جیسے اس وقت بھی زمین اسی طرح ان کے پاؤں تھامے ہے اور انھوں نے تعجب سے نیچے کی طرف دیکھا۔ جگن بہو ان کی ٹانگوں میں باہیں ڈالے ان کے قدموں پر سر جھکائے تھی۔ وہ جسم بھر سے کانپنے لگے۔ ان کا ایک ہاتھ خود بخود اس کی اُجڑی ہوئی مانگ کی طرف بڑھ گیا۔ انھوں نے بیوہ کے سر کو تھپتھپایا، اس کی باہوں کو اپنی ٹانگوں سے نرمی سے الگ کیا اور سکھدیو کی طرف بڑھ کر بولے:-

"اچھا! اچھا! لاؤ کلھاڑا" اور وہ خود ہی آم کے تنے کو کاٹنے لگے۔ ان کے تیز چلتے ہوئے ہاتھوں کی گرفت، ان کی آنکھوں میں خوشی کی چمک اور ان کے چہرے پر دوڑتا ہوا رنگ صاف صاف بتاتے تھے کہ دونوں ٹوٹے پلوں کی مرمت اب ایک یقینی بات ہے۔

ماتم

آسمان پر کفن کا سا سفید بادل چھا رہا تھا اور ہوا میں کافور کی بو بسی ہوئی تھی۔
میاں جی کا جنازہ ابھی ابھی اٹھا تھا۔ مگر جنازہ اٹھنے پر گھروں میں جو قیامت بپا ہو جاتی ہے اس سے میاں جی کی چار دیواری محروم رہ گئی تھی۔ کھلے آنگن کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک عورتیں ایک دوسرے میں کچھ یوں پیوست ہو کر بیٹھی تھیں کہ اگر ایک اٹھتی تو سب کی سب اٹھی چلی جاتیں۔ مگر سب شدید حد تک خاموش تھیں۔ خاموشی اور شدید خاموشی کے درمیان سکوت سے سناٹے کا فاصلہ ہے اور موت والے اس گھر کے آنگن پر یہی مہیب سناٹا مسلط تھا بچوں تک نے دم سادھ لیا تھا منڈیر پر بیٹھا ہوا کوا بھی جیسے لاؤڈ اسپیکر پر کائیں کائیں کر رہا تھا۔
"تیر تیر تیر" یکایک ایک عورت کوے کی طرف بازو اٹھا کر پکاری کوا اڑ گیا اور وہ مجمعے سے مخاطب ہو کر بولی۔ "ماتم کے گھروں میں بھی ہڈیاں ڈھونڈنے نکلتے ہیں ہوئے کلموہے زمانے بھر کے"۔ پھر ایک لمبی "ہاہ" کے ساتھ اس نے اپنا بازو سمیٹ لیا۔
مجمعے کو شاید اس بات کا انتظار تھا کہ کوئی بولے تو ہم بھی بولیں۔ اس لئے سب بولنے لگیں اور سب نے جیسے ایک ساتھ پہلو بدلے۔
"ہائے چاری بی بی" کسی نے کہا۔
آنگن کے پرلے گوشے سے ایک بوڑھیا نے پوچھا۔ "بی بی روئی کہ نہیں"؟
"نہیں" کوٹھے کے دروازے کے پاس سے جواب آیا۔ "ویسے ہی بیٹھی ٹکر ٹکر دیکھے جا رہی ہے"۔
وہی بڑھیا بولی "اسے رلانے کی کوئی تدبیر کرو کمبختو۔ ورنہ اس کا کلیجہ لٹھے کی طرح جھر سے پھٹ جائے گا۔ یہ سکتہ کی بیماری ہے پتہ بھی نہیں چلتا اور جان ہوا ہو جاتی ہے۔ نوراں اپنے بیٹے کے مرنے پر یوں ہی مر گئی تھی"۔

جدید اُردو افسانہ تقسیم سے پہلے ہی اپنی ارتقائی منزلیں طے کر چکا تھا۔ اس سرمائے کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات آسانی سے معلوم کی جا سکتی ہے کہ مختصر افسانہ پریم چند کے دور سے بہت آگے پہنچ چکا ہے۔ نہ صرف یہ کہ پریم چند کی حقیقت نگاری اور جدید حقیقت نگاری میں بہت فرق ہے بلکہ جن پیچ در پیچ مسائل سے نئے افسانے کو عہدہ برا ہونا پڑا ہے ان مسائل کا ادراک پریم چند یا پریم چند کے معاصرین کے یہاں نہیں ملتا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تقسیم کے بعد اُردو میں مختصر افسانہ نگاری کو زوال ہوا ہے لیکن یہ خیال ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ دراصل تقسیم سے پہلے ہمارے بعض افسانہ نگاروں نے اوّل درجے کے افسانے تخلیق کیے تقسیم کے بعد یا تو وہ خاموش ہو گئے یا جو افسانے لکھے وہ اُس معیار کے نہیں تھے جس کو انھوں نے اپنے بہترین افسانوں میں برقرار رکھا تھا۔ لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے بعض پرانے افسانہ نگاروں نے اپنے بہترین افسانے تقسیم کے بعد لکھے اور ان کے فن میں بعض خوشگوار تبدیلیاں آئیں اور اس کے ساتھ ہی بہت سے نو وارد افسانہ نگار سامنے آئے جن کی وجہ سے اُردو افسانے میں بعض بالکل نئے عناصر کا اضافہ ہوا تو کوئی وجہ نہیں کہ مجموعی طور پر جدید اُردو افسانہ ایک قدم آگے نہ بڑھا ہو۔

ایم۔ حبیب خاں کا نام بحیثیت محقق اُردو دان طبقے کے لئے نیا نہیں۔ کئی سال سے ان کے اہم علمی و تحقیقی مضامین ہند و پاک کے مقتدر رسالوں میں شائع ہو رہے ہیں اور اہل علم سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ لیکن اس انتخاب کا جو لوگ مطالعہ کریں گے انھیں اندازہ ہو گا کہ ان کے اندر نہ صرف تحقیق و تلاش کا جذبہ ہے بلکہ عام محققوں کے برخلاف، ان کو تنقیدی و ادبی بصیرت کا بھی وافر حصّہ ملا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے موضوعات پر تحقیق نہیں کرتے جو موجودہ دور میں کسی افادیت یا معنویت کے حامل نہ ہوں۔ وہ سالہا سال سے انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ سے وابستہ ہیں اور اس کے کتب خانے کی ترتیب و تنظیم

سب کی نظریں بی بی پر جم گئیں جس نے اپنے میاں کے مرنے پر ابتک ایک آنسو بھی نہیں ٹپکایا تھا وہ اِدھر اُدھر دیکھ بھی لیتی تھی۔ ہوں ہاں سے باتوں کا بھی جواب دے دیتی تھی مگر روتی نہیں تھی۔

"رو بی بی جی کھول کے رو" پرلی طرف سے ادھیڑ عمر کی بھاگاں اپنے آپ کو کھینچ کر اُٹھی اور عورتوں کو لانگھتی اور بین کرتی ہوئی دروازے کی طرف یوں بڑھی جیسے بی بی کو رُلا کر ہی دم لے گی۔ علاقے بھر میں اس سے بہتر بین کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ انگشت شہادت کو آسمان کی طرف اٹھا کر اسے ماتمی دائروں میں گھماتے ہوئے وہ بولی۔ "تیرے سر کے پھول کو آج موت کا بگولا اڑا لے گیا۔ بی بی بہن تیرے دنوں پر اب سورج کبھی نہیں چمکے گا۔ میری لٹی پٹی سہیلی۔ اتنے ڈراؤنے اندھیرے میں تو فرشتے بھی رو دیں بی بی اور تو ہے کہ ایک چیخ بھی نہیں مارتی۔ میاں جی کا جنازہ اُٹھ گیا تو اب اپنی میت پر ہی رو لے۔"

"میں مر جو گئی ہوں بھاگاں"۔ بی بی نے آہستہ سے کہا اور یہاں سے وہاں تک عورتیں یوں کڑک کر رو دیں کہ ان کی گودوں میں دبکے ہوئے بچے بھی بلبلا اُٹھے جن کے کانوں میں بی بی کی آواز نہ پہنچ سکی وہ اپنے آس پاس سے رونے کی وجہ پوچھ کر رو دیں حتیٰ کہ یہ ماتمی لہر آنگن کے پہلے سرے تک پھیل گئی۔ وہ بچے جو جنازے کے پیچھے نکل گئے تھے۔ ماتم کی گونج سُن کر بھاگتے ہوئے آئے اور آنگن میں جھانکنے لگے۔ جو بچے سناٹے سے سہم کر ماؤں کے پاس ٹھنسے ہوئے بیٹھے تھے، اُٹھے اور کوٹھے کے دروازے سے لگ کر بی بی کو گھورنے لگے۔

بی بی کا چہرہ فق تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا خالی پن تھا جیسے ان میں سے کوئی کچھ نکال کر لے گیا ہے اس کے ہونٹ مٹی ہو رہے تھے اور اس کی کلائی کے ایک زخم پر ایک مکھی بار بار آ کر بیٹھ جاتی تھی جب حافظ جی نے یکایک بلند آواز سے کلمہ شہادت پڑھ کر میاں جی کے دم توڑنے کا اعلان کیا تھا تو کوٹھے کی دہلیز پر بیٹھی ہوئی بی بی نے اپنی ناک کی کیل نوچ کر پھینک دی تھی اور چھنن چھنن سے اپنی چوڑیاں توڑ ڈالی تھیں اور جب اُدھر میاں جی کا ڈاٹھا بندھ رہا تھا تو ادھر عورتیں سوئی کی مدد سے بی بی کی کلائی میں سے کانچ کا ایک ٹکڑا نکال رہی تھیں۔

بی بی کو پچاس برس کی عمر میں بھی چوڑیاں پہننے کا شوق تھا۔ میاں جی کو ساٹھ برس کی

عمر میں بھی بی بی کی کلائیوں میں چوڑیاں دیکھنے کا شوق تھا۔ سفید کلائی پر ویسے بھی ہر رنگ کی چوڑی سج جاتی ہے مگر میاں جی تو چوڑیوں کے انتخاب کے معاملے میں فن کار تھے۔ ایسے ایسے رنگوں کی چوڑیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے تھے کہ آج تک وہ رنگ نہ کسی نے دیکھے تھے نہ سُنے تھے۔ ایک بار تو انھوں نے بی بی سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ جی چاہتا ہے تمہارے سارے جسم پر چوڑیاں چڑھا دوں۔

میاں جی کو قسم قسم کی پلیٹیں جمع کرنے کا بھی بڑا شوق تھا۔ اسی لئے گول، چوکور تکونی اور کناروں والی پلیٹوں کا انبار ان کے ہاں جمع ہو گیا تھا اور وہ پلیٹ تو انھیں بہت عزیز تھی جو وہ پوما سے لائے تھے۔ ان دنوں وہ فوج میں جمعدار کلرک تھے۔ کوئی چینی پھیری والا پلیٹیں بیچتا پھرتا تھا۔ اس پلیٹ کے وسط میں بھرے بھرے جسم کی ایک چینی لڑکی کی تصویر تھی جو انگور کی بیلوں کے حاشیئے میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ میاں جی کہتے تھے کہ جب انھوں نے یہ تصویر دیکھی تو ان کے سامنے بی بی کی صورت گھوم گئی۔ سو انھوں نے چینی کو منہ مانگے دام دے کر یہ پلیٹ خرید لی تھی۔ اور جب چھٹی پر آئے تھے تو بکس میں سے یہ پلیٹ نکال کر بی بی سے کہا تھا۔ "جس طرح کہانیوں کے جنوں بھوتوں کی جان طوطی میں ہوتی ہے اس طرح تمہارے اس جن کی جان اس پلیٹ میں ہے اس لئے کہ پلیٹ میں تم ہو۔"

بی بی نے یہ پلیٹ برسوں تک اپنے کلیجے سے لگا رکھی تھی۔ دم توڑنے سے ذرا دیر پہلے میاں جی نے فرمائش کی تھی کہ انھیں دواء المسک اسی پلیٹ میں رکھ کر کھلائی جائے۔ اب بھی وہ پلیٹ کوٹھے کے اندر ایک الماری میں رکھی تھی، اور بی بی بار بار اس کی طرف یوں دیکھ لیتی تھی جیسے ابھی بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگے گی۔ مگر نہ جانے یکایک عین موقعے پر اسے رونا کیوں بھول گیا تھا۔

رونا تو اس کا ایک ہتھیار تھا وہ تو میاں جی کی ایسی باتوں پر بھی رو دیتی تھی کہ آج کے سالن میں کل والا مزا نہیں ہے اور اسے روتا دیکھ کر میاں جی کو صادق دل سے اعتراف کرنا پڑتا تھا کہ مغلوں کے شاہی باورچیوں کو بھی اس مزے کا سالن تیار کرنے کا نسخہ معلوم

نہ تھا۔ ان کی کوئی اولاد نہ تھی اس لئے دونوں خود ہی کبھی کبھی بچے بن جاتے تھے۔ خوب خوب روٹھتے اور روتے تھے۔ "تم مجھ سے ویسا پیار نہیں کرتیں جیسا میں کرتا ہوں" میاں جی کہتے۔ اور بی بی اپنی کنپٹیوں کی سفیدی کے باوجود مچل جاتی کہ میاں جی نے اس کے ایمان پر حملہ کیا ہے۔

اور آج میاں جی اس گھر میں سے ہمیشہ کے لئے اُٹھ گئے تھے۔ اب وہ شام کی نماز پڑھ کر واپس آنے والے میاں جی کے قدموں کی چاپ کبھی نہیں سُن سکے گی۔ اب کبھی یوں نہیں ہوگا کہ آدھی رات کو اس کی آنکھ کھلے تو اس کا سر میاں جی کے زانو پر رکھا ہو اور میاں جی اس کے ہونٹوں کے خطوط پر اپنی ایک انگلی کی پور پھیر رہے ہوں، اب کچھ بھی تو نہیں ہوگا۔ بی بی یہ سب کچھ سوچ رہی تھی مگر اسے ان سوچوں پر بھی تو رونا نہیں آرہا تھا۔

اگر اس کے آنسوؤں کا رونا یکایک خشک ہوگیا تھا تو جب بھی کم سے کم دنیا داری کے لئے تو اس کا رونا ضروری تھا۔ میاں جی کی دور نزدیک کی رشتہ داریں بھاں بھاں روتی ہوئی آئیں اور بی بی کو گلے سے لگا کر ایسے ایسے بین کئے کہ دشمنوں کے کلیجے بھی پگھل جائیں۔ مگر جب وہ بی بی سے الگ ہوئیں اور اس کی آنکھوں میں دھول اڑتی دیکھی، تو بعض حیران رہ گئیں۔ بعضوں نے نفرت سے مُنہ پھیر لیا اور بعضوں نے چپکے سے دوسری کے کان میں کہا۔ "دنیا میں یہ پہلی بیوی ہے جو اپنے میاں کی موت پر خوش ہوئی ہے"۔ پھر یہ سرگوشیاں صحن میں دور و نزدیک پھیل گئیں۔ یہاں سے وہاں تک عورتیں رونے کے بجائے ناکوں اور ٹھوڑیوں پر انگلیاں رکھ کر کھُسر پھُسر کرنے لگیں، دروازے سے لگ کر کھڑے ہوئے بچے بھی بی بی سے مایوس ہو کر اپنے کوٹھے میں کھیلنے لگے اور وہ اس ہجوم میں اکیلی رہ گئی۔

رونا کوشش سے نہیں آتا یہ تو محبت کی طرح بڑی بے ساختہ چیز ہے۔ مگر بی بی رونے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ اس نے پچھلے تین برسوں کا ایک ایک واقعہ یاد کر ڈالا کئی بار اس نے محسوس کیا کہ برسات کی رات ہے چھت پر بوندیں بج رہی ہیں بادل کہیں

دور جیسے نیند میں گرج رہا ہے۔ کوٹھے میں میلی میلی روشنی والا دیا جل رہا ہے۔ میاں جی کا سر اس کے بالوں میں ڈوب گیا ہے اور اس کے ہونٹوں کو میاں جی کے سینے کے بال چھو رہے ہیں۔ ان یادوں نے اسے جیسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھلکا ڈالا مگر اس کی آنکھوں میں اسی طرح ریت کھٹکتی رہی۔

کئی بار بی بی نے اس جگہ کو گھورا جہاں میاں جی کی میت جنازہ اٹھنے تک پڑی رہی تھی وہ ان پر پچھاڑیں کھا کھا کر گری تھی۔ مگر لوگ پچھاڑوں کو نہیں دیکھتے۔ آنسوؤں کو دیکھتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر تو بعض حیوان بھی پچھاڑیں کھا کھا کر گر جاتے ہیں۔ انسان کی پہچان تو آنسو ہیں۔ انسان روئے نہیں تو کوئی کیسے مانے کہ اس کا دل دکھا ہے۔

آنگن کے ایک ایک چپے سے بی بی کی زندگی کے کتنے واقعے چمٹے ہوئے تھے۔ ان دیواروں اور ان منڈیروں پر آج کتنی اجنبیاں اتر آئی تھیں۔ بی بی نے رونے کی خاطر ایک ایک چیز کو گھورا۔ اس کی نظریں منڈیروں، دیواروں اور دروازے پر سے گھومتی ہوئی کوٹھے کے اندر داخل ہو گئیں۔

یکایک وہ تڑپ کر اٹھی۔ دروازے کی طرف ایک قدم بڑھایا اور پھر ایک بلند چیخ کے ساتھ سینے پر نہایت زور کا دوہتڑ مار کر وہیں ڈھیر ہو گئی۔

بھاگاں اٹھ کر اس کی طرف لپکی اور پھر آنگن کے پرلے سرے تک تمام عورتیں اٹھی چلی گئیں ——— "کیا ہوا؟ کسی نے پوچھا۔

اور بھاگاں نے جیسے ایک مژدہ سناتے ہوئے کہا بی بی رو رہی ہے" چند عورتوں نے بلکتی اور سسکتی ہوئی بی بی کا بھیگا ہوا چہرہ اٹھا کر دوسری عورتوں کو دکھایا اور سب جیسے حیران ہو کر بولیں۔ "یہ تو زار زار رو رہی ہے بیچاری"۔ پھر اندر کوٹھے میں کسی عورت نے ایک بچے کے زور کا چانٹا مارا اور اسے بازو سے گھسیٹتی ہوئی۔ دہلیز پر لا کر پکاری۔ نامراد نے بی بی کی پلیٹ کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں۔

پھرتے ہیں میر خوار.....!

جاڑوں کی رات تھی سرِشام ہی سناٹا پڑ گیا تھا۔ میری ہمیشہ کی عادت ہے کہ دیر سے سوتا ہوں۔ کبھی اول شب نیند نہیں آئی۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ گھر کے اور لوگ تو کبھی کے اپنے اپنے بستروں پر جا چکے تھے۔ میں کچھ دیر تک تو ایک جاسوسی ناول پڑھتا رہا۔ اس کے بعد یوں ہی بیٹھے بیٹھے گنگنانے لگا ؎

چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا　　نہ پھول تھے، نہ چمن تھا، نہ آشیانہ تھا
اے باغباں تجھے کیا کیا نشان بتلاؤں　　.....

دوسرے شعر کا مصرعہ ثانی اب یاد نہیں غالباً محمد علی جوہر کی مشہور غزل کا شعر ہے۔ ان دنوں فلم "دیوداس" نئی نئی ریلیز ہوئی تھی۔ آنجہانی سہگل کے گانوں سے گلی کوچے گونج رہے تھے۔ جس کو دیکھئے الاپ رہا ہے "بالم آئے بسو مورے من میں" لیکن یہ غزل پہاڑی سانیال نے گائی تھی۔ فلم میں تو مجھ کو یہ گانا زیادہ پسند آیا نہیں مگر نہ جانے کیوں اس وقت اس کو گنگنانے لگا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ میں کئی سال بعد لکھنؤ واپس آیا تھا۔ پرانا مکان چھٹ چکا تھا اور نئے مکان میں یہ میری پہلی شب تھی۔ پچھلے گھر سے بہت سی ایسی یادیں وابستہ تھیں جن کے اظہار کا یہاں موقع نہیں۔

گنگناتے گنگناتے مزے میں جو آیا تو اونچے سروں میں گانے لگا۔ میرا کمرہ سب سے الگ تھلگ سڑک کے رخ پر تھا اس لئے یہ بھی خدشہ نہیں تھا کہ گھر میں کسی کی نیند خراب ہوگی۔ پوری غزل ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ اچانک کسی نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ میں لحاف میں دبکا دبکایا بیٹھا تھا باہر نکلنے کو جی نہ چاہا۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے پوچھا "کون ہے؟" باہر سے آواز آئی "ذرا دروازہ تو کھولئے" لہجہ میرے لئے

بالکل اجنبی تھا۔ خدا معلوم کون اس جاڑے پالے میں نازل ہوا تھا۔ بادل نخواستہ لحاف چھوڑا اور سردی سے کپکپاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ دروازہ کھولا تو سامنے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی کھڑا تھا جنگلی کبوتر کی سی سُرخ سُرخ آنکھیں، موٹی سی ناک، گھنی مونچھیں، سر پر لکھنوی بانکوں کے سے پٹھے، چہرے پر عجیب سی کرختگی، بڑا ہی بدشکل آدمی تھا۔ ایک بار اس نے نظر بھر کر دیکھا اور بڑی بے تکلفی کے ساتھ کمرے کے اندر آ گیا۔ اس نے اپنی پرانی اونی شال کو اچھی طرح جسم کے گرد لپیٹا اور اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں ابھی تک خاموش کھڑا تھا۔ مجھے اس طرح حیرت زدہ دیکھ کر کہنے لگا "کھڑے کیوں ہیں، بیٹھ جائیے"

میں نے قریب پڑی ہوئی کرسی کھسکائی اور چپ چاپ اس پر بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے اپنے پیر سے جوتا نکالا اور میرے سامنے ڈال دیا اور بڑی عاجزی سے بولا۔ "دس جوتے مار دیجئے"!

میں سٹ پٹا کے رہ گیا۔ یا اللہ یہ کیا مصیبت آئی۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے اور بھی رقت آمیز لہجے میں کہا "اجی دیکھ کیا رہے ہیں، اٹھائیے جوتا" پھر اس نے سر پر سے ٹوپی اُتاری اور گردن جھکا کر بولا "لیجئے یہ سر حاضر ہے"!

جی تو چاہا کہ دس کے بجائے تڑاتڑ بیس جوتے لگاؤں۔ سخت طیش آیا لیکن جس قدر مجھ کو طیش آ رہا تھا وہ اسی قدر بھیگی بلّی کی طرح مسکین بنا بیٹھا تھا۔ میری سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کیا کہوں! عجیب افتاد پڑی تھی۔ ذرا غور تو کیجئے کہ ایک اچھا خاصا معمر آدمی آپ کے سر ہو جائے کہ دس جوتے مار دیجئے اور وہ بھی خواہ مخواہ ایسے موقع پر سوائے بدحواس ہو جانے کے اور ہو ہی کیا سکتا ہے؟

مجھے بھونچکا دیکھ کر وہ کہنے لگا "نہیں مار سکتے" اس دفعہ اس کے لہجے میں تیکھا پن تھا۔ لمحہ بھر وہ خاموش رہا۔ پھر اس نے اپنی سُرخ سُرخ وحشت زدہ آنکھوں سے مجھے گھور کر دیکھا اور گردن اونچی کر کے بولا "للہ اپنا یہ راگ بند کر دیجئے"!

اُس نے میرے آگے عاجزی سے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ اس حرکت پر غصہ بھی آیا۔ کچھ ہنسی بھی آئی۔ مجھے اپنے بے سرے پن کا احساس کبھی نہ

اتنی شدت سے نہیں دلایا تھا مگر بات کہنے کا اس نے جو انداز اختیار کیا تھا وہ بڑا انوکھا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں توبہ کی کہ اب بھولے سے بھی کبھی نہیں گنگناؤں گا۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ ہے کون۔ یہ معمہ ذرا دیر بعد اس نے خود ہی حل کر دیا۔ کہنے لگا :۔ "معاف کیجئے گا اس گستاخی کو میں بہت دیر سے لیٹا ہوا آپ کی آواز سن رہا تھا۔ بہت ضبط کیا مگر جب مجبور ہو گیا تو آپ کے پاس چلا آیا۔ بات یہ ہے کہ مجھ کو بھی گانے بجانے سے کچھ لگاؤ ہے۔ جس دُھن میں آپ گا رہے تھے وہ اساوری راگ ہے اس کو یوں الاپتے ہیں" یہ کہہ کر اس نے مدھم سُروں میں گنگنانا شروع کیا۔ کئی منٹ تک وہ ایک ہی مصرعے کو الاپتا رہا پھر اس نے اساوری پر ایک لمبا سا لیکچر دیا اور اپنی پُرانی شال سنبھالتا ہوا اُٹھ کر کمرے سے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں دیر تک سکتے کے سے عالم میں خاموش بیٹھا رہا۔ بار بار یہ خیال ستاتا رہا کہ یہ غزل تو بڑی مہنگی پڑی بہر حال استاد شیری سے یہ میری پہلی ملاقات تھی اور اس پہلی ہی ملاقات میں ان سے اس قدر متاثر ہوا کہ آج تک کبھی غسل خانے میں بھی گنگنانے کی ہمت نہیں ہوئی۔

دوسرے ہی دن مجھے پتہ چل گیا کہ نیا مکان جس قدر اچھا تھا محلہ اسی قدر واہیات تھا۔ پاس پڑوس کے گھروں میں زیادہ تر کشمیری بھانڈ آباد تھے۔ عورتوں کی طرح انکی بھی لمبی چوٹیاں مردانے لباس پر بڑی عجیب و غریب معلوم ہوتیں۔ لیکن جب وہ مجرا کرتے تو نو عمر لڑکوں کو تو پہچاننا مشکل ہو جاتا۔ لچکے گوٹے سے مزین لہنگا اور چولی پہن کر جب وہ زرتار دوپٹے کا گھونگھٹ نکال کر بھاؤ بتاتے تو طوائفوں تک کا رنگ پھینکا پڑ جاتا لیکن ان میں سب ناچنے والے نہیں تھے۔ بعض صرف نقل کرتے تھے اور ٹھٹھول بازی کر کے اہل محفل کو ہنساتے تھے۔ جن کی عمریں ڈھل گئی تھیں وہ محض گانا گاتے تھے یا کبھی کبھار کسی پرانے قدر دان کی فرمائش پر مجرا بھی کر لیتے تھے ورنہ عام طور پر یہ نوجوان لڑکوں کا حصہ تھا۔

ان دنوں کرامت جان کا بڑا شہرہ تھا اور اس کو یہ شہرت "چندراولی" کے

کھیل کی بدولت ملی تھی جس کو اس کی پارٹی بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کرتی تھی۔ کرامت جان خود چندراولی کا پارٹ ادا کرتا تھا۔ چھریرا جسم، ناک، نقشہ، ببک، آواز میں سوز چندراولی کے روپ میں جب وہ گاتا تو محفل میں سماں بندھ جاتا۔

سنا ہے کہ استاد شیری شروع شروع میں کرامت جان کے چچا فرحت جان کی ٹولی میں شامل تھے اور "چندراولی" کے کھیل میں ڈاکو دربجے سنگھ کا پارٹ ادا کرتے تھے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ جب وہ چہرے پر سیاہی مل کر اپنی سرخ سرخ انگارہ سی آنکھیں نکال کر سپاہیوں کو ڈانٹتے اور طبلے کی تھاپ پر تان لگاتے تھے۔

"رسی کرو دراز" باندھو کمر میں چست"

تو ان کی پاٹ دار آواز سے محفل میں جان پڑ جاتی۔ تھے تو وہ ذات کے بھانڈ مگر ان کا تعلق کشمیری بھانڈوں کے نچلے طبقے سے تھا جن کو عرف عام میں ڈھپالی کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ گانے بجانے کے بجائے عام طور پر طبلہ منڈھنے کا کام کرتے ہیں۔ استاد شیری نے بھی لڑکپن میں طبلوں پر کھالیں منڈھی تھیں مزاج میں نک چڑھاپن ہمیشہ سے تھا۔ ایک روز کسی سے لاگ ڈانٹ پڑ گئی بس اسی روز روپے سوا روپے کی روزی پر لات مار کر کلن استاد کے یہاں جا پہنچے وہ اپنے وقت کے مانے ہوئے سارنگی نواز تھے۔ جن لوگوں نے کلن استاد کے پاس ان کو دیکھا ہے ان کا بیان ہے کہ استاد شیری نے استاد کی خدمت کا حق ادا کر دیا۔ چلمیں بھرنا اور ٹانگیں دبانا تو خیر معمولی بات تھی۔ بیماری کے زمانے میں انھوں نے استاد کو ہاتھوں پر تھکوایا تھا۔ تین چار میل روزانہ استاد کو پیٹھ پر لیستارے کی طرح اٹھاکر اسپتال لے جاتے تھے۔ مہینوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر کلن استاد کا مزاج خدا کی پناہ بگولہ تھے بگولہ۔ غصہ آگیا تو پھر جو چیز سامنے آئی وہ اٹھاکر کھینچ ماری۔ اس سے غرض نہیں کہ سر پھٹ گیا یا ٹانگ ٹوٹ گئی۔ لیکن جب وہ پانچ سال کی ریاضت کے بعد کلن استاد کے یہاں سے نکلے تو اپنے فن میں کامل ہو کر نکلے۔

میں نے استاد شیری کو جس وقت دیکھا وہ کشمیری بھانڈوں کی طرح سنگت چھوڑ چکے تھے اور طوائفوں کو تعلیم دیتے تھے۔ روزانہ سہ پہر کو وہ اپنے ٹیوشن پر جاتے اس وقت ان کی وضع قطع یہ ہوتی، سر پر دوپلی ٹوپی، ڈھیلی ڈھالی اچکن، چوڑی دار پائجامہ اور براؤن پمپ شو اور بغل میں غلاف کے اندر لپٹی ہوئی سارنگی دبی ہوتی۔

چوک کی طوائفوں کو تعلیم دینے کے علاوہ استاد شیری کے گھر پر بھی کچھ نوجوان گانا سیکھنے آتے تھے۔ گالیاں بکنے میں استاد شیری کا جواب نہیں تھا۔ یہ خصوصیت ان کو استاد کلن سے ترکے میں ملی تھی۔ مزاج بھی کچھ ایسا ہی پایا تھا کہ ذرا سی بات پر برہم ہو جاتے۔ پھر یہ نہیں دیکھتے تھے کہ منہ سے کیا لفظ نکل رہا ہے۔ جو جی میں آتا اول فول بکتے چلے جاتے۔

گھر پر جو لوگ ان سے تعلیم لینے آتے تھے وہ زیادہ تر اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اچھے گھرانوں کے نوجوان تھے۔ ان میں نیپال کے شاہی خاندان کا ایک لڑکا تھا۔ رانا جوگندر بہادر نام تھا۔ بڑا ہنس مکھ اور مہذب نوجوان تھا موسیقی سے بہت لگاؤ تھا۔ یہی شوق کشاں کشاں لکھنؤ کھینچ لایا۔ مجھ سے بھی اسکی تھوڑی سی یاد اللہ ہو گئی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بسنت پنچمی کے دوسرے دن کا ذکر ہے کہ دوپہر کا وقت تھا، میں اپنے کمرے میں بیٹھا کسی کو خط لکھ رہا تھا۔ استاد کا مکان عین میرے کمرے کے مقابل تھا۔ درمیان میں دس فٹ کی سڑک تھی۔ ان کی بیٹھک کی ایک ایک بات مجھے سنائی پڑتی تھی۔ اس وقت وہ رانا جوگندر بہادر کو سبق دے رہے تھے۔ راگوں کے نام تو اب تک مجھے یاد نہ ہو سکے۔ البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ اس روز وہ کوئی نیا راگ بتا رہے تھے۔ رانا بول نہیں ٹھیک سے ادا کر رہا تھا، استاد شیری دو بار اس کو ٹوک چکے تھے۔ ایکا ایکی وہ زور سے چیخے "ہوش میں ہے یا بھنگ چڑھا کر آیا ہے"؟

اس کے بعد انھوں نے رانا کو ایک بار پھر سمجھایا۔ دو تین بار خود اونچے سروں میں راگ کے بول نکالے مگر رانا سے پھر چوک ہو گئی۔ استاد نے بڑی ثقیل سی گالی دی اور ڈانٹ کر بولے "پھر وہی پنچم میں۔ اب کی جو بہکا تو سالے کے حلق میں پورا گز (سارنگی کا گز) اتار دوں گا"۔

اس دفعہ استاد دیر تک الاپتے رہے۔ رک رک کر ہر بول پر سمجھاتے جاتے۔ رانا جوگندر بہادر نے ایک بار پھر سارے گا ما پا دھا نی الاپنا شروع کیا مگر بات نہ بن سکی۔ استاد جل کر بولے "دھت تیری کی۔ تجھ کو سکھانے والے کی"۔ انھوں نے جوش میں اپنی مری ہوئی ماں کو بھی نہ بخشا اور مرحومہ کے ساتھ ایک گندا سا رشتہ جوڑ کر کہنے لگے "اچھا اب تم بڑھاؤ اپنا ٹٹو.....!"

اس کے بعد گہری خاموشی چھا گئی۔ ذرا دیر بعد میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا رانا جوگندر بہادر ان کی خوشامد کر رہا تھا اور وہ تھے کہ کسی طرح پیٹھ پر ہاتھ ہی نہیں رکھنے دے رہے تھے آخر دروازہ بند کر کے اندر چلے گئے۔ رانا بے چارہ بڑی دیر تک منہ لٹکائے دروازے پر کھڑا رہا۔ استاد نے پلٹ کر خبر بھی نہ لی۔ اس کے بعد میں نے رانا کو ان کے یہاں پھر کبھی نہیں دیکھا۔

اس سے بھی زیادہ عبرتناک منظر ایک اور دیکھنے میں آیا۔ اس روز بھی استاد شیری کسی شاگرد کو ڈانٹ رہے تھے اور شاگرد بار بار غلطی کر رہا تھا۔ ایکا ایکی اونچی آواز سے گالیاں بکنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے گھبرا کر باہر دیکھا تو ایک نوجوان دروازہ کھول کر استاد کی بیٹھک سے باہر نکل رہا تھا۔ یہ میرے ایک ملنے والے تھے گوکل چند رستوگی۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم اے کے طالب علم تھے۔ مزاج میں رکھ رکھاؤ اور سلیقہ تھا۔ شعر و شاعری سے خاصا شغف تھا۔ موسیقی کا نیا نیا شوق ہوا تھا۔ میں نے غور کیا کہ وہ اس وقت بے حد بدحواس نظر آ رہے تھے۔ جیسے وہ دروازے سے نکلے ان کے پیچھے پیچھے استاد بھی نکلے۔ ان کے ہاتھ میں سارنگی بجانے کی مضراب تھی۔

کی ذمہ داری کو بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں۔ کتب خانے کے ماحول میں رہ کر وہ صرف کرم کتابی نہیں بنے بلکہ نئے اور زندہ ادب کے امکانات پر بھی ان کی نظر ہے۔ وہ تحقیق برائے تحقیق کے مرض میں مبتلا نہیں بلکہ ہماری کوششیں تخلیقی ادب کی ابیاری کے لئے صرف کر رہے ہیں۔ اُردو کے موجودہ اہل تحقیق کیلئے ان کا یہ عمل قابلِ تقلید ہے۔

موصوف نے ۱۹۵۸ء کے بہترین افسانوں کا ایک انتخاب مرتب کیا ہے۔ اس مجموعے میں یوں تو کئی اہم افسانہ نگاروں کی تخلیقات شامل ہیں لیکن ان کے علاوہ بہت سے ایسے افسانہ نگاروں کے نام ابھی باقی ہیں جن کے افسانوں کو شامل کئے بغیر اُردو کا کوئی نمایندہ افسانوی مجموعہ مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ مرتب نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ اس انتخاب میں صرف انھیں حضرات کے افسانے شریک ہیں جنہوں نے اپنا افسانہ اس کتاب میں شامل کرنے کی اجازت دی۔ بقیہ حضرات نے یا تو اجازت نہیں دی یا ان کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ چنانچہ اس مجبوری کے سبب انھیں ایک ایسا طریقہ سوچنا پڑا کہ اپنے حدود میں رہ کر ہی ایسا مجموعہ ترتیب دیا جائے کہ جس سے موجودہ اُردو افسانے کا رخ متعین کیا جا سکے۔ چنانچہ ان افسانہ نگاروں کے ایسے مشہور افسانے لے لئے گئے جو ۱۹۵۸ء کے لکھے ہوئے ہیں لیکن ان سارے افسانوں کو مجموعی طور پر ایک ساتھ پڑھا جائے تو اُردو افسانے کے جدید ترین رجحانات کو متعین کیا جا سکے۔ میں سمجھتا ہوں اپنے اوپر اتنی شرطیں عائد کر کے صرف ایک سال کے افسانوی ادب سے اتنی چیزیں چن لینا جن سے موجودہ افسانے کی سمت اور رفتار کا اندازہ لگانے میں نہ صرف عام قارئین بلکہ اچھے خاصے پیشہ ور نقادوں کو بھی مدد ملے بڑا پتہ ماری کا کام تھا۔ ایم حبیب خاں نے یہ کام بڑی لگن اور سلیقے سے کیا ہے جس کا ہر شخص اعتراف کرے گا۔

خلیل الرحمٰن اعظمی

شعبہ اُردو۔ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۰ء

گوکل چند نے جوان کو دیکھا تو اپنی چپل چھوڑ کر سڑک پر ننگے پاؤں بھد بھد کر کے بھاگنا شروع کر دیا۔ اور استاد گالیاں دیتے ہوئے پیچھے پیچھے دوڑے۔

کوئی سو سوا سو گز دونوں دوڑتے رہے۔ سارے راہ گیر ٹھٹک کر رہ گئے۔ دوکان دار دوکانیں چھوڑ کر باہر آ گئے اور حیرت سے دیکھنے لگے کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ استاد واپس لوٹے تو سانس پھولی ہوئی تھی۔ منہ سے کف جاری تھا اور برابر بڑبڑاتے جا رہے تھے۔

ان کی انہی حرکتوں کا نتیجہ تھا کہ اکثر شاگرد چند ہی روز میں بھاگ کھڑے ہوتے۔ اپنی اس بدمزاجی کے باعث وہ کسی طوائف کے یہاں زیادہ نہ ٹکے۔ آخری بار ان کا جو ٹیوشن چھٹا اس کی وجہ بھی یہی بدمزاجی تھی۔ ان دنوں وہ چوک کی مشہور طوائف دلربا کے یہاں کسی لڑکی کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ ایک تو رنڈی کی لڑکی اور پھر وہ بھی بلا کی شوخ۔ بات بات پر اٹھکھیلیاں کرنا اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ ایک روز بار بار منع کرنے پر بھی وہ برابر غلط بول نکالتی رہی۔ استاد نے ایک دفعہ جل کر کہا "اب کی دیکھ یہاں انترہ لگایا تو سالی کا منہ توڑ کر رکھ دوں گا"۔ مگر اس نے پھر وہی انترہ لگایا۔ اور غضب یہ کیا کہ کھی کھی کر کے ہنس پڑی۔ استاد شیری کچھ اس قدر بھنائے کہ پاس رکھا ہوا شیشے کا گلاس کھینچ کر دے مارا بھوں پھٹ گئی۔ وہ گلا پھاڑ کر چیخی "ہائے اماں میں مر گئی"۔

چاروں طرف سے رنڈیاں اور بھڑوے دوڑ پڑے۔ لڑکی کی پیشانی سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔ دلربا نے اس کی یہ حالت دیکھی تو سر پیٹ لیا۔ لیکن ڈیرے دار طوائف تھی۔ ہر وقت کا رئیسوں کے ساتھ سابقہ تھا مزاج میں بڑا رکھ رکھاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ ہاتھ جوڑ کر استاد سے صرف اس قدر کہا "استاد ہم تو باز آئے اس تعلیم سے۔ خدانخواستہ بچی کی آنکھ جاتی رہتی تو اس کی تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قسمت پھوٹ گئی تھی"۔

استاد شیری پھر بھی نہ پسیجے۔ تیوری پر بل ڈال کر بولے "مجھ سے تعلیم دلوانا ہے

تو یہی ہوگا ورنہ کسی اور کو ڈھونڈھ لو۔ شہر میں بہت سے گویے پڑے ہیں۔" اتنا کہہ کر انھوں نے سارنگی پر غلاف چڑھایا اور اس کو بغل میں دبا کر بالاخانے سے اتر کر نیچے آگئے۔ دوبارہ بھول کر بھی اس طرف کا رُخ نہ کیا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ دلربا خود منانے آئی تھی مگر استاد کچھ اس قدر برہم تھے کہ اسی روز یہ عہد کیا کہ اب کسی رنڈی کو تعلیم نہیں دیں گے۔ ہوا بھی یہی کہ وہ پھر کبھی بغل میں سارنگی دبا کر شام کے وقت چوک کی جانب جاتے نظر نہیں آئے۔

(۲)

استاد شیری کی بدمزاجی صرف شاگردوں ہی کے لئے نہیں تھی۔ گھر والے اور بھی زیادہ مورد عتاب تھے۔ ان کی تین لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا۔ لڑکے کا نام منصور علی تھا۔ اولادوں میں سب سے بڑا وہی تھا۔ اچھا خاصا چل نکلا تھا۔ استاد کا حال یہ تھا کہ جہاں فرصت ملی سارنگی اٹھائی اور لڑکے کو تعلیم دینا شروع کر دی۔ ذرا چوکا اور استاد نے گالی دی۔ زیادہ جھنجھلائے تو ہاتھ چھوڑ بیٹھے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ مار پیٹ سے کام نہیں چلا تو دالان کے کھمبے سے باندھ کر چابکوں سے مارتے تھے۔ اس وقت گھر بھر پر وحشت طاری ہوتی تھی کس کی مجال کہ ان کو ٹوکے۔ مگر کوئی نہ کوئی لڑکی بھائی کی محبت میں بول ہی پڑتی۔ اور گڑگڑا کر استاد سے کہتی کہ "اللہ ابا! بھیا کو اب نہ ماریئے۔" استاد خونخوار نظروں سے گھور کر اسے دیکھتے اور موٹی سی گالی دے کر اسے بھی گھسیٹ کر کسی دوسرے کھمبے سے باندھ دیتے اب دونوں پر مار پڑتی۔ اسی دوران میں کسی اور لڑکی کی شامت آجاتی تو وہ بول پڑتی اس کا بھی وہی حشر ہوتا۔

استاد کے گھر کا دالان بہت وسیع تھا۔ اس کے سات آٹھ ستون تھے۔ اور کبھی کبھی یہ بھی ہوا کہ تمام لڑکیاں اور لڑکے دالان کے کھمبوں سے بندھے ہوئے ہیں اور باری باری ہر ایک کے چابکیں پڑ رہی ہیں۔ بیوی ان کی فطرتاً کچھ بے حس واقع ہوئی تھیں۔ خاموش بیٹھی تماشا دیکھا کرتیں۔ جب دیکھا نہ جاتا تو اُٹھ کر

پڑوس میں کسی کے گھر چلی جاتیں اور جو شامت اعمال کہیں بول پڑیں تو وہ بھی کھمبے سے باندھ دی جاتیں۔

یہ عجیب ڈرامائی منظر تھا۔ استاد شیری ہاتھ میں لمبی سی چابک لئے سرکس کے ٹرینر کی طرح اس سرے سے اس سرے تک ٹہل رہے تھے۔ جس نے فریاد کے لئے زبان کھولی سڑاک سے اس کے ایک چابک دی اور کبھی خاموش رہنے پر بھی اس سرے سے اس سرے تک سڑاسڑ چابکیں برساتے چلے جاتے۔

ایسے موقعوں پر ان کی سب سے چھوٹی بچی مشکل کشائی کرتی تھی۔ وہ اُستاد کی نظر بچا کر باہر چلی جاتی اور استاد کے ماموں کو بلا کر لے آتی۔ وہ بوڑھے آدمی تھے۔ بڑی مشکل سے لاٹھی کا سہارا لے کر کپکپاتے ہوئے آتے اور اپنے پوپلے منہ سے استاد کو وہ وہ گالیاں دیتے کہ استاد کے ذخیرے میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ گالیوں کا اضافہ ہی ہو جاتا۔

استاد شیری کی ماں کا انتقال ان کی کم سنی ہی میں ہو گیا تھا اور ماموں نے ان کو پالا پوسا تھا۔ اس لئے وہ ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ بڑے میاں آتے تو سب کی رہائی ہوتی۔ جب کبھی ایسا معرکہ پڑتا تو استاد ماموں کی آواز سنتے ہی رفوچکر ہو جاتے اور اس روز وہ رات کو دیر سے گھر لوٹتے۔ تو یہ کبھی نہیں ہوا کہ واپسی پر مٹھائی کا وہ دونا ان کے ہاتھ میں نہ دبا ہو۔ آتے ہی ایک ایک بچے کو جگاتے اور خود اپنے ہاتھ سے ہر ایک کو مٹھائی کھلاتے۔ ان کے کردار میں ایسے ہی اور نہ جانے کتنے تضاد تھے۔

گالیاں بکنے کے معاملے میں وہ بڑے پھوہڑ تھے۔ جہاں غصہ آیا بھڑ سے گالی دے بیٹھے۔ ایک روز سہ پہر کے وقت استاد منصور علی کو تعلیم دے رہے تھے۔ اس نے کوئی غلط سُر نکالا استاد نے فوراً گالی دی۔ قریب ہی ان کی بیوی بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ انھوں نے بھڑک کر کہا "ذرا تو کسی کا خیال کیا کرو، سیانی سیانی لڑکیاں بیٹھی ہیں اور تم ہو کہ جو منہ میں آیا بک جاتے ہو۔

تمہاری گالیوں نے تو ناک میں دم کر دیا ہے"۔ استاد بجائے اس کے کہ کچھ نادم ہوتے بگڑ کر کہنے لگے" اچھا تو ہم اب گالی بکتے ہیں" پھر انھوں نے بیوی کے بارے میں ایک انتہائی گندی بات کہی اور چیخ کر بولے" اور یہ اولادیں تو تم جہیز میں لائی تھیں"۔ بیوی بچاری کو سانپ سونگھ گیا پھر ان کی آواز نہ سنائی پڑی۔

استاد نے طوائفوں کو تعلیم دینا بند کی تو پھر گھر پر تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ اب انھوں نے اپنا نام استاد شیری کے بجائے مرزا شیر علی بیگ رکھ لیا تھا۔ پہلے ان کے شاگرد ان کو استاد کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اب وہ ان کو مرزا صاحب کہنے لگے۔ اگر بھولے سے کوئی استاد کہہ کر بلاتا تو وہ بھڑک اُٹھتے اور گالیاں بکنا شروع کر دیتے تھے۔

ان دنوں ان کا بیشتر وقت گھر ہی پر گذرتا تھا۔ سویرے تڑکے ہی سے سارنگی لے کر بیٹھ جاتے اور شام تک راگنیوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ اب ان میں ایک نیا مرض پیدا ہو گیا تھا کہ موسیقی پر لیکچر دیتے تھے۔ وہ ہر ہر بات پر لیکچر بازی کرنے لگے تھے۔ ان کی اس نئی عادت کا شکار بیوی تھی جو بچاری سیدھی سادی گھریلو عورت تھی اور استاد تھے کہ اس سے موسیقی کے بارہ ٹھاٹھوں پر بات کرتے کرتے سیاست پر بحث شروع کر دیتے۔ اکثر رات کے سناٹے میں استاد شیری کی پاٹ دار آواز سُنائی دیتی وہ اس وقت کسی نہ کسی موضوع پر لیکچر دیتے ہوتے۔ یہ لیکچر ذرا ذرا سی گھریلو باتوں سے شروع ہوتے تھے۔

یہ محض اتفاق تھا کہ یہ لیکچر بازی ان کو راس آگئی اور وہ میوزک کالج میں باقاعدہ لیکچرار ہو گئے۔ اس تبدیلی سے استاد شیری کی وضعداری میں تو کوئی فرق نہ پیدا ہوا البتہ یہ انقلاب ضرور رونما ہوا کہ ان کے دروازے پر ایک بڑی سی تختی لٹکنے لگی جس پر انگریزی کے موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا: پروفیسر شیر علی بیگ ـــــ حالانکہ استاد انگریزی سے قطعی نا آشنا تھے۔ مگر اب وہ پروفیسر کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ دو چار دفعہ کی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد

گھر پر آنے والے شاگردوں نے ان کو پروفیسر کہنا شروع کر دیا۔

اس کے بعد انھوں نے اپنی برادری کے کشمیری بھانڈوں سے بھی تقریباً ملنا جلنا ترک کر دیا اور قرابت داریوں کو ناجائز حمل کی طرح چھپاتے پھرتے۔ لیکن انھوں نے محلہ نہ چھوڑا۔ اس کا سب سے بڑا سبب ان کا گھر تھا جو بقول ان کے بزرگوں کی یادگار تھا البتہ اس کھنڈر نما مکان کو انھوں نے آئے دن مرمت کرا کرا کے اچھا خاصا شاندار بنا لیا تھا۔

آمدنی معقول تھی مزے سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ اب وہ اور بھی وزنی گالیاں بکنے لگے تھے۔ شاگردوں کو بات بات پر کتوں کی طرح دھتکارتے تھے شاگرد بھی خوب تھے دم سادھے بیٹھے رہتے چوں تک نہ کرتے ان میں بعض ایسے تھے جن سے میرے مراسم تھے پوچھا بھائی یہ استاد شیری میں کیا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے کہ دھڑا دھڑ گالیاں کھایا کرتے ہو کسی اور سے کیوں نہیں سیکھتے۔ مگر سب کی متفقہ رائے تھی کہ جس طرح سارنگی بجانے میں دور دور تک استاد شیری کا جواب نہیں تھا اسی طرح وہ راگ داری کے رگ و ریشہ سے واقف تھے۔ اس قدر مہارت تھی کہ بتانے پر آتے تو یہ تک بتا جاتے کہ فلاں راگ کا موجد کون تھا کس زمانہ میں نکالا اور اب تک اس میں کیا کیا تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔

ان ہی دنوں کا ذکر ہے کہ راجہ بانکی پور کے یہاں ایک تقریب تھی۔ اس سلسلے میں محفل موسیقی کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ استاد شیری کو بھی بلایا گیا وہ اب مجروں میں بہت کم جایا کرتے تھے مگر منصور علی کے اصرار پر چلے گئے۔ راجہ صاحب نے بڑے دھوم دھام سے جشن کا بندوبست کیا تھا۔ شہر کے سارے کلاکاروں کو انھوں نے اکٹھا کر لیا تھا۔ رات بھر راگ رنگ کی محفل گرم رہی سنگیت کے وہ وہ روپ دیکھنے میں آئے کہ مزا آ گیا البتہ استاد کے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا ہوا یہ کہ رات کے کوئی گیارہ بجے بے نظیر نے ایک ٹھمری گائی بے نظیر کے عروج کا زمانہ تھا قبول صورت طوائف تھی کھلتا ہوا چمپئی رنگ تیکھے نقش و نگار نکلتا ہوا چھریرہ جسم اس نے ٹھمری چھیڑی تو محفل میں آگ لگ گئی بول تھے اندھیریا ہے رات سجن رہو کہ جیو آدھی رات کا وقت اودھ کے تعلقداروں کی محفل بے نظیر نے ترپ کے ساتھ ٹھمری کے بول ادا کئے

تو وہ مجون شباب آوار کا کام کر گئی۔ ہر طرف سے واہ واہ ہونے لگی۔ روپوں کی بارش شروع ہو گئی۔ محفل میں راجہ صاحب بھٹو بھی موجود تھے۔ اُن دنوں بے نظیر ان کے پاس تھی۔ انھوں نے دونوں ہاتھوں سے روپیہ نچھاور کیا۔ داد دیتے دیتے ان کا گلا خشک ہو گیا۔

ٹھمری کی جان ترت ہے اور بے نظیر نے ترت بتانے میں بانکی چتونوں کی ایک ایک گھات اور بدن کی ہر چھب داؤں پر لگا دی۔ اہل محفل بار بار پہلو بدلتے۔ تعلقدار بار بار راجہ بھٹو کو چھیڑتے اور وہ بڑے فخر کے ساتھ مسکرا مسکرا کر ہر ایک کو دیکھتے۔ غرضیکہ ایک ہنگامۂ ہاؤ ہو برپا ہو گیا۔

بے نظیر کا مجرا ختم ہوا۔ تو محفل کا رنگ بدل چکا تھا۔ اُس کے فوراً ہی بعد اُستاد شیری کا پروگرام تھا۔ وہ حسب معمول ڈھیلی ڈھالی اچکن اور دوپلی ٹوپی لگائے ہوئے تھے۔ ان کی یہ وضع قطع دیکھ کر کچھ منچلے بھڑکے۔ مگر صرف مسکرا کر رہ گئے۔ انھوں نے ایمن راگ چھیڑا اور دھیرے دھیرے استھائی میں چلے مگر محفل کا مطالبہ کچھ اور تھا۔ اور اُستاد کو اس کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ وہ طبلہ کی سنگت کے ساتھ مدھم سروں میں سارنگی بجاتے رہے۔ ذرا دیر تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد سننے والوں کی دلچسپی بھٹکنے لگی اور محفل پر ایک اکتاہٹ سی طاری ہو گئی۔ اس محفل میں سرجو الا پرشاد سریواستو بھی شریک تھے۔ غالباً مہمان خصوصی تھے۔ ان سے ضبط نہ ہو سکا مسکرا کر بولے "اُستاد جی، یہ آپ نے کیا روں روں لگا رکھی ہے۔ ذرا کچھ اچھے ہاتھ دکھائیے"۔ اُستاد شیری محفل سے کچھ یونہی بیزار تھے۔ سرجو پی سریواستو کا یہ جملہ سنتے ہی ان کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ فوراً ہاتھ روک لیا پلٹ کر طبلچی کی طرف دیکھا۔ اور ڈانٹ کر کہنے لگے "روک بے ہاتھ"۔ طبلچی نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ استاد نے خاموشی کے ساتھ قریب رکھا ہوا سارنگی کا غلاف اُٹھایا اور سارنگی کو اس میں لپیٹنے لگے۔

سرجو الا پرشاد کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مسکرا کر بولے "اُستاد جی معلوم ہوتا ہے کہ آپ میری بات کا بُرا مان گئے۔ بیٹے تو آپ سے ایک درخواست کی تھی۔ آپ کو کچھ سنا کر جانا پڑے گا"۔ راجہ بانکی پور نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اُستاد نے جل کر کہا "اجی سنانے

والے کی تو۔" انھوں نے ایک گندی سی گالی دی۔ اور بدستور سارنگی کو غلاف میں لپیٹتے رہے۔
"آپ نے مجھ کو کوئی میراثی سمجھا ہے۔ برسوں خون پانی کر کے ریاض کیا ہے۔ رنڈیوں کی چلمیں نہیں بھری ہیں واہ صاحب واہ کیا قدر دانی کی ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ سالے ایسے بد ذوقوں سے پالا پڑے گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

محفل پر سنّاٹا طاری ہو گیا۔ سر جوالا پرشاد ان دنوں وائسرائے کی کونسل کے ہوم ممبر تھے۔ لوگوں نے سوچا کہ اگر استاد اسی وقت جوتے مار کر نہ نکالے گئے تو جیل کی ہوا ضرور کھانا پڑے گی۔ سرِ محفل انھوں نے ہوم ممبر کی بے عزّتی کی تھی۔ لیکن استاد بڑی بے نیازی کے ساتھ اٹھے اور ایک شانِ استغنا کے ساتھ محفل سے اُٹھ کر چلے گئے
سُنا ہے کہ سر جوالا پرشاد خود استاد کو منا کر پھر محفل میں لائے۔ اُس کے بعد استاد شیری نے بہار کا خیال چھیڑا۔ اور کئی گھنٹے تک سارنگی پر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہے۔
کہنے والے کہتے ہیں کہ استاد کا یہ عالم تھا کہ آنکھیں بند تھیں جسم پتھر کی طرح ایک جگہ جم کر رہ گیا تھا۔ صرف ہاتھ چل رہا تھا اور سارنگی سے سنگیت کی بارش ہو رہی تھی۔

یہ پھاگن کی رات تھی۔ ہوا میں پھولوں کی مہک تھی۔ اور ہر طرف چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ کچھ تو موسم کا اثر اور کچھ اُستاد چوٹ کھا کے اپنا کمال دکھا رہے تھے۔ سماں بندھ گیا استاد شیری نے ٹھمری کی تندی، ٹھرّے کے نشے کی طرح اتار کر رکھ دی۔ وہ رنگ باندھا کہ بہار کی کیفیت طاری ہو گئی۔

رات ڈھلتی رہی اور استاد کا ہاتھ سارنگی پر چلتا رہا۔ کلیاں چٹکنے لگیں، پھولوں کے تختے مہکنے لگے۔ چاندنی کی رنگت نکھر گئی۔ ہوائیں بھنوروں کی پائل بجنے لگی محفل پر سنّاٹا چھا گیا ہر شخص مبہوت تھا۔
جب انھوں نے ہاتھ روکا تو وہ اکڑ کر رہ گیا۔ واللہ اعلم یہ واقعہ کہاں تک درست ہے۔ میں تو اس محفل میں شریک نہیں تھا۔ البتہ اتنا ضرور میں نے دیکھا کہ استاد شیری نے شاگردوں کو کچھ عرصہ کے لئے تعلیم دینا بند کر دی تھی۔ اور ان کا ہاتھ سفید پٹّی میں جھولتا رہتا تھا۔ صبح کچھ روزانہ سویرے سویرے ایک مالشیا آکر گھٹنوں مالش کیا کرتا تھا۔

اس بات کو زمانہ ہو گیا۔ زندگی میں بہت سے تغیرات رونما ہوئے۔ استاد شیری

میں بھی بہت بڑا تغیر ہوا۔ اس کا انکشاف مجھ پر بالکل اچانک ہوا۔ ایک روز ایسا ہوا کہ وہ اپنا ایک ٹیلیگرام پڑھوانے میرے پاس آئے (جب ان کے شاگرد موجود نہ ہوتے تھے تو وہ اس قسم کی خدمات اکثر مجھ سے لیا کرتے تھے۔ اُس وقت میرے ایک دوست بھی کمرے میں موجود تھے میں نے اُستاد کا اُن سے تعارف کرایا۔ "آپ ملئے آپ اُستاد شیری ہیں میوزک کالج میں پروفیسر ہیں۔ سارنگی بجاتے ہیں اپنا جواب نہیں رکھتے۔" میں نے تعارف کرانے میں حتی الوسع یہ کوشش کی تھی کہ کہیں منہ سے ایسی بات نہ نکل جائے کہ اُستاد کی طبع نازک پر بار گزرے۔ مگر غلطی سرزد ہو گئی۔ اس کا اندازہ مجھے استاد کی سُرخ آنکھوں کے جلال سے ہوا۔ انھوں نے تیوری پر بل ڈال کر مجھ کو قہر آلود نگاہوں سے کچھ اس طرح دیکھا کہ اگر کوئی شاگرد ہوتا تو منہ پر وہ جھاپ پڑتا کہ دن میں تارے نظر آجاتے۔ میں چونکہ اس سعادت سے محروم تھا۔ لہذا انھوں نے صرف نگاہِ عتاب پر اکتفا کیا اور میرے دوست سے کہنے لگا "جناب مجھ کو پرنس مرزا شیر علی گورگانی کہتے ہیں۔ میوزک کالج میں پروفیسر ضرور ہوں۔ مگر میرا خاندانی پیشہ نہیں ہے۔" اس کے بعد اُستاد نے جو اپنا شجرۂ نسب بتانا شروع کیا تو سلاطین مغلیہ سے اپنا رشتہ ملا دیا۔ وہ دیر تک اس بات پر زور دیتے رہے کہ وہ آلِ تیمور میں سے ہیں۔ موسیقی جو عام طور پر ان کی گفتگو کا موضوع ہوا کرتی تھی۔ اسوقت انھوں نے اس کے متعلق ایک لفظ نہ کہا۔ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ ان کے جانے کے بعد بھی میں سوچتا رہا کہ استاد شیری نے بڑے زناٹے کی زقند لگائی ہے۔ آج تک تو انھوں نے اشارتاً اس بات کا اظہار نہیں کیا تھا یہ اچانک ان پر مغل شہزادے ہونے کا انکشاف کیسے ہوا۔!

تحقیقات کرنے پر پتہ چلا کہ یہ دور کی کوڑی ان کے صاحبزادے منصور علی لائے تھے۔ جو خیر سے اب ٹیوشن پڑھانے لگے تھے اور ان دنوں کسی کی عوضی پر میوزک کالج میں گانے کی تعلیم بھی دے رہے تھے۔ قصہ کچھ اس طرح سننے میں آیا کہ کالج میں ایک روز کسی گویّے نے منصور علی کو بھانڈ کہا اور خود کو واجد علی شاہ کا پڑپوتا بتایا۔ اس وقت تو بات تکار تک پہنچ کر ختم ہو گئی مگر منصور علی نے سنجیدگی کے ساتھ چلنا شروع کر دیا اور

ایک دن وہ اُس گویّے سے ایک ڈگری زیادہ بڑے شہزادے بن گئے۔ اُستاد نے نہ صرف اس تجویز کو قبول کرلیا۔ بلکہ باقاعدہ اس کی تبلیغ بھی شروع کردی۔ ان کے مکان کی تختی بھی بدل گئی۔ البتہ کشمیری بھانڈوں میں اس تبدیلی پر چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ اور استاد کے خلاف ایک محاذ قائم ہوگیا۔ جس میں محلّے کے کچھ ایسے رہنے والے بھی شامل ہوگئے۔ جو بھانڈوں کی برادری میں نہیں تھے۔

جن دنوں میں یہ کشمکش زوروں پر تھی۔ میں لکھنؤ چھوڑ کر کراچی آگیا اور یہاں آکر ایسا پھنسا کہ لکھنؤ جانا نصیب نہ ہوا۔ موسیقی سے مجھے کبھی زیادہ لگاؤ نہ تھا اور نہ ہے۔ اسی لئے کبھی استاد شیری کی یاد بھی نہ آئی۔

(۱۳)

پچھلے سال کا ذکر ہے۔ میں ایک عزیز سے ملنے ملیر گیا تھا واپسی پر بس کے انتظار میں بس اسٹینڈ پر کھڑا تھا۔ کہ کسی نے قریب آکر بڑے لکھنوی انداز میں جھک کر سلام کیا جھٹ پٹے کا وقت، میں اس شخص کا چہرہ نہ دیکھ سکا البتہ اتنا ضرور خیال آیا کہ اس کو کہیں دیکھا ضرور ہے۔ کہاں دیکھا ہے اور کس جگہ دیکھا ہے؟ یہ بات یاد نہ آئی تو اس نے خود ہی کہا: "نہیں پہچانا۔ ہاں بھئی غریبوں کو کون پہچانتا ہے۔ یہ اس ساری سرزمین کی خاصیت ہے۔" میں نے فوراً پہچان لیا۔ استاد شیری ہے۔ ابھی خیریت و عافیت پوچھنے کا سلسلہ جاری تھا کہ اس اثنا میں میری بس آگئی اور میں اسی میں سوار ہوکر چلا آیا۔ اس وقت بڑی عجلت میں تھا۔ یہ بھی پوچھنے کا موقع نہ ملا کہ ان کا قیام کہاں ہے! اور کب تک یہاں ٹھہریں گے۔ عارضی طور پر آئے ہیں یا منتقل ہجرت کرکے پاکستان چلے آئے ہیں لیکن یہ میں نے ضرور اندازہ لگایا کہ ان کی حالت کچھ پتلی تھی۔ اُس روز وہ شیروانی بھی میلی کچیلی پہنے ہوئے تھے اور آواز میں وہ کرّارہ پن بھی نہیں تھا جس کو سنکر سینکڑوں کے ہجوم میں اُنکو پہچانا جاسکتا ہے۔ کوئی ہفتہ بھر بعد استاد شیری سے پھر مڈبھیڑ ہوگئی۔ اُس روز خاصی تفصیلی

ملاقات رہی۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ ان کو کراچی آئے ہوئے سات آٹھ ماہ کا عرصہ ہو چکا ہے۔ دونوں بڑی لڑکیوں کی شادی انھوں نے لکھنؤ ہی میں کر دی تھی۔ میوزک کالج کی ملازمت پرنسپل کی مہاسبھائی ذہنیت کے باعث جاتی رہی۔ بات صرف اتنی تھی کہ ہولی کے تہوار پر پرنسپل نے کالج کے تمام اساتذہ کو اپنے گھر پر مدعو کیا تھا۔ ہولی منانے کا پروگرام تھا۔ استاد شیری صوم وصلوٰۃ کے پابند مسلمان تھے۔ پرنسپل کے منہ پر صاف صاف کہہ دیا "کہ میں رنگ کھیل کر خود کو جہنمی بنانا نہیں چاہتا لہٰذا مجھ کو تو اس شیطانی چرخے سے باز رکھا جائے"۔ پرنسپل نے ان کے مذہبی جذبات کا احترام کرنے کے بجائے کاٹ پیچ شروع کر دی۔ پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ استاد شیری کو کالج ہمیشہ کے لئے چھوڑنا پڑا۔ ملازمت سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی وہ مزے میں تھے۔ گھر پر اچھے خاصے شاگرد آجاتے تھے۔ انہی دنوں منصور علی پاکستان چلا آیا۔ اسی کی تحریک پر وہ بھی چلے آئے میں نے پوچھا "منصور علی کہاں ہے؟" کہنے لگے "اس نے قوالوں کی ایک چوکی بنائی ہے اور آجکل خیرپور میں ہے"۔ میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا "قوالوں کی چوکی"! وہ مسکرا کر بولے "آخر کچھ نہ کچھ تو پیٹ کا دھندا کرتا۔ یہاں گانے بجانے کی کون قدر کرتا ہے"۔ "اور آپ؟" غیر ارادی طور پر میں پوچھ بیٹھا۔ یکبارگی پرانے استاد شیری جاگ اٹھے۔ انھوں نے ایک سڑی ہوئی گالی دی۔ اور غصے سے بولے "اجی قوالی بھی کوئی راگ ہے لاحول ولا قوۃ۔ منصور میرے سر بہت ہوا۔ میں نے کہا، ابے بیدھا ہوا ہے۔ اب میں قوالی گاؤں گا۔ ذرا غور تو کیجئے۔ زندگی بھر کا ریاض چند ٹکوں کی خاطر قربان کر دوں۔ واہ صاحب واہ۔ یہ بھی ایک رہی۔"!

وہ دیر تک اسی قسم کی بات کرتے رہے۔ مگر ان کی حالت بڑی ابتر تھی۔ اچکن بیحد بوسیدہ ہو گئی تھی۔ پائجامہ پر گھٹنے کے پاس بڑا سا پیوند لگا تھا۔ چہرہ اور بھی بدشکل ہو گیا تھا۔

آخر دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے استاد شیری رخصت ہو گئے۔

دیباچہ

اُردو ادب میں افسانوں کی بڑی اہمیت ہے۔ کسی زبان کا ادب اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس میں افسانے شامل نہ کئے جائیں ویسے بھی افسانہ کی روایت اُردو ادب میں بہت پُرانی ہے۔ زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کی شکلیں بھی بدلتی رہیں۔ کبھی اس نے داستان کی شکل اختیار کر کے لوگوں کے دل بہلائے کبھی کہانی کے روپ میں یہ مذہبی اور اخلاقی سبق سکھانے ہمارے سامنے آیا۔ بہر حال افسانوں کی بنیاد کم و بیش قصے کہانیوں پر ہی مبنی ہے جن کی ادبی اور تاریخی حیثیت تسلیم کی جا چکی ہے حسن و عشق کی داستانوں کو منظر عام پر لانے میں ارباب فورٹ ولیم کالج کے کارنامے اُردو ادب میں ایک اہم خصوصیت کے حامل ہیں۔ اس کالج میں اُردو کے مقتدر اہل قلم نے بیسیوں مختصر اور ضخیم قصے کہانیاں طبع زاد لکھیں اور ترجمہ کیں۔ صحیح معنوں میں اگر اُردو افسانے کے ارتقا کا جائزہ لیا جائے تو انشا کی مشہور و معروف کتاب "کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان" کو بہت کچھ دخل ہے انشا نے ۱۸۰۳ء میں یہ کہانی لکھ کر اُردو مختصر افسانہ نگاری کی روایت کو ایک نیا روپ بخشا۔ کہانی کی سادگی اور دلکشی نے پڑھنے والے کے دلوں کو جیت لیا۔ یہ کہانی نہ صرف مقبول ہوئی بلکہ لوگ اس کو بڑی دلچسپی اور شوق سے پڑھنے لگے۔ انیسویں صدی کے اوائل سے پہلے انشا کی کہانی کے علاوہ قدیم اُردو افسانہ نگاری کا کوئی نمونہ اُردو ادب میں نظر نہیں آتا اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ کہانی اُردو مختصر افسانہ نگاری کی نہ صرف پہلی تخلیق کہی جا سکتی ہے بلکہ اس فن کی بڑی حد تک نمایندگی بھی کرتی ہے

دراصل اُردو میں جدید افسانہ نگاری کا آغاز بیسویں صدی کے اوائل سے ہوا اس دور میں سوائے منشی پریم چند کے کوئی دوسرا نہ تھا اس لئے یہی جدید افسانہ

چند ہی روز بعد وہ میرے دفتر آئے۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد بولے "ریڈیو کے بخاری صاحب سے آپ کی کچھ ملاقات ہے؟" میں نے انکار کیا تو ان کا چہرہ اُتر گیا۔ نہ جانے وہ میرے پاس کیا کیا توقعات لے کر آئے تھے! بڑے پژمردہ لہجے میں بولے "میں نے سوچا تھا کہ شاید آپ کے توسط سے ان تک رسائی ہو جائے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ بغیر سفارش کے یہاں کوئی کام نہیں بنتا۔" میں نے غور کیا کہ استاد بشری کو زندگی برتنے کا گُر اب تک نہ آیا۔ وہ اپنے فن میں اس قدر مگن تھے کہ کبھی جھانک کر بھی زندگی کو دیکھنے کا موقع نہ ملا۔ میری سفید پوشی سے مرعوب ہو گئے اور یہ سمجھ بیٹھے کہ یہاں آ کر میں بڑی توپ بن گیا ہوں۔ انھیں یہ خبر نہیں کہ سفارش وزیروں کی چلتی ہے افسرانِ حکام کی چلتی ہے اور وہ بھی کاروباری بنیادوں پر اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے والی بات ہے۔

مجھ کو دیکھ کر اُستاد نے بات کا رُخ پلٹ دیا کہنے لگے منصور کا خط آیا ہے۔ وہ بھی آجکل بہت پریشان ہے لکھا ہے کہ اس کا گلا خراب ہو گیا ہے۔ کسی نے سینڈور کھلا دیا ہے۔" لمحہ بھر توقف کے بعد بولے "اجی سینڈور وینڈور کسی نے کیا کھلایا ہوگا۔ سالے نے قوالیاں گا گا کر اپنی آواز کا ستیاناس کر لیا۔"

اُس روز بھی اپنی پریشانیوں کا ذکر کرتے رہے چلتے وقت بہت جھجکتے ہوئے انھوں نے کہا "کچھ روپے ہوں گے آپ کے پاس بچہ دو روز سے گھر میں فاقہ پڑا ہے۔" یہ کہہ کر وہ اس طرح سہم کر کھڑے ہو گئے جیسے چوری کرتے پکڑے گئے ہوں۔

میرے پاس اس وقت ایک روپیہ تھا۔ دو روپے دفتر میں ایک صاحب سے لے کر ان کو تین روپے دیئے اور گھر کا پتہ دیا۔ کہ وہاں آ جائیں۔ کچھ اور بندوبست کر دیا جائے گا واقعہ یہ ہے کہ ان کا حال سُن کر کلیجہ دھک سے ہو گیا تھا۔

دوسرے ہی دن وہ گھر پر آئے۔ میں نے دس روپے اور دئے انھوں نے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے نوٹ پکڑا۔ لمحہ بھر تک بُت بنے کھڑے رہے اور پھر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر اس طرح دھاڑیں مار مار کر روئے جیسے کوئی اپنے رشتہ دار کی میّت کے سرہانے کھڑے ہو کر روتا ہے۔

اس کے بعد وہ ایک عرصہ تک نہیں ملے۔ میں نے سوچا کہیں کام کاج مل گیا ہوگا۔ مگر جب وہ ملے تو ان کی حالت اور بھی سوختہ ساماں تھی۔ اچکن جگہ جگہ سے مسک گئی تھی اُن کی موٹی سی ناک پچک کر رہ گئی تھی اور جنگلی کبوتر کی سی سُرخ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ اُس روز وہ صرف اس غرض سے آئے تھے کہ میں اُن کو کہیں چپراسی ہی کی ملازمت دلوادوں۔ اس دفعہ بھی میں نے اُن کو کچھ رقم دی اور وعدہ کیا کہ کہیں نوکری دلوادوں گا۔

اس کے بعد وہ برابر آتے رہے۔ ہر بار میں وعدہ کرتا رہا اور وہ ہر بار اس پر یقین کر کے چلے جاتے۔ اپنی عبرتناک حالت کی ایک المناک داستان سُنا ڈالتے آخر وہ وقت بھی آگیا کہ میں اُن سے اُکتا گیا اس کی بُنیادی وجہ یہ تھی کہ میں ہر بار ان کی مالی امداد کرنے سے معذور تھا۔

ایک دن وہ آئے تو میں نے کہلوا دیا کہ "کہدو گھر پر نہیں ہیں" نہ جانے کیا بات تھی کہ واپس جانے کے بجائے وہ دروازے پر رُک گئے۔ اور ٹہل ٹہل کر میرا انتظار کرتے رہے۔ عجیب مصیبت تھی کہ میں گھر کے اندر قید تھا اور وہ دروازے پر گویا پہرا دے رہے تھے۔ شاید ۹ بجے دن کو وہ آئے تھے سہ پہر تک اسی طرح ٹہلتے رہے۔ مجھے ان کی حالت پر ترس بھی آیا خدا معلوم وہ کس عالم میں میرے پاس آئے تھے اور صبح کے بھوکے پیاسے اس طرح بے چینی کے ساتھ میرا انتظار کر رہے تھے۔

مشکل یہ تھی کہ گھر ایک ہی دروازے کا تھا جس پر وہ موجود تھے۔ ورنہ میں کسی نہ کسی طرح ان کے پاس چلا آتا۔ جب تک وہ موجود رہے بڑا ذہنی کرب رہا۔ جھٹ پٹا ہونے سے کچھ دیر قبل وہ چلے گئے اس وقت وہ بیماروں کی طرح لاغر نظر آرہے تھے۔ اس کے بعد دوبارہ میرے گھر پر نہیں آئے ایک مدت گزر گئی خدا جانے کس

عالم میں تھے چند ماہ پہلے کا واقعہ ہے کہ مجھے اپنے ایک رشتہ دار کے لئے رائیڈنگ شوتیار کرانے کی غرض سے جوتے بنانے والے ایک کارخانہ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں مجھے ایک شخص میں استاد شیری کی شباہت معلوم ہوئی۔ وہ فرش پر بیٹھا رانپی سے بڑی محویت کے عالم میں چمڑا کاٹ رہا تھا۔ گرمی کا موسم تھا۔ اس کے بدن پر صرف ایک گندہ سا نیکر تھا۔ ایک ایک ہڈی نظر آرہی تھی۔

اس نے گردن اٹھا کر دیکھا تو میں ششدر رہ گیا۔ استاد شیری تھے میں نے دل ہی دل میں کہا کہ استاد نے مجھے یہاں دیکھ لیا۔ تو بڑے ہی خفیف ہوں گے۔ لہذا مجھے فوراً یہاں سے اٹھ جانا چاہیئے۔ مگر انھوں نے مجھے دیکھ لیا تھا اور خلاف توقع بڑی گرمجوشی سے بولے:۔

"ارے آپ ہیں۔ کہئے خیریت تو ہے۔"

اس کے بعد انھوں نے فوراً باہر والے کو آواز دے کر بلایا اور دو پیالہ چائے کا آرڈر دے دیا۔ میں نے اظہار ہمدردی کے طور پر کہا "مرزا صاحب یہ آپ نے کیا حالت بنا رکھی ہے۔ ہنس کر بولے" بھائی دونوں وقت پیٹ بھر کر روٹی مل جاتی ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے"۔

میں نے کہا "تو گویا موسیقی کو آپ نے بالکل ترک کر دیا!"

بڑی شانِ استغنا کے ساتھ بولے" اجی لعنت بھیجئے سالے گانے کے فن کو۔"

اس کے بعد انھوں نے موسیقی کے فن کو بڑی گندی گندی گالیاں دیں اور پھر خاموش ہو کر بڑے اطمینان سے گردن نیچی کر کے رانپی سے چمڑا کاٹنے لگے۔ پہلی بار مجھے اس حقیقت کا اندازہ ہوا کہ استاد شیری کو میں جس قدر سادہ لوح سمجھتا تھا وہ ایسے نہ تھے کم از کم اس دفعہ انھوں نے دانشمندی کا ثبوت دیا۔ ایسا فن سیکھا کہ جس کی ضرورت امر مسلمہ تھی آدمی جوتے بغیر تو رہ نہیں سکتا۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ جن انگلیوں سے وہ نغموں کا جادو جگاتے تھے آج ان سے جوتیاں گانٹھ رہے تھے۔

زہر

کتنی عجیب موت تھی۔ جن لوگوں نے گزشتہ شام کو مسز نعمان کے ساتھ چائے پی تھی جلسے میں ان کی تقریر سنی تھی۔ انھیں تو ان کی موت کا یقین ہی نہیں آتا تھا۔ بے خوابی کی تو انھیں برسوں سے شکایت تھی اور نیند کی گولیاں وہ کوئی آج سے نہیں کھا رہی تھیں جو بھول چوک کا شبہ ہوتا۔

حسب معمول رات کو بارہ بجے ٹوٹیں مسٹر نعمان دس ہی بجے سو جانے کے عادی تھے ان کے کمرے کا دروازہ حسب دستور بند تھا۔ آیا نے کھانے کو پوچھا مگر مسز نعمان نے انکار کر دیا۔ دودھ کو پوچھا تو کہہ دیا کہ لے آؤ۔ مگر دودھ کو انھوں نے ہاتھ بھی نہ لگایا۔ راتوں کو جاگنے کے بعد وہ عام طور پر صبح دیر تک سونے کی عادی تھیں۔ مسٹر نعمان دفتر چلے گئے۔ جب گیارہ بج گئے۔ اور مسز نعمان نے چائے طلب نہیں کی تو آیا کو فکر ہوئی جوں ہی اس نے جگانے کے لئے ان کے پیروں کو ہاتھ لگایا ایسے چیخ مار کر رہ گئی جیسے اسے بجلی کا جھٹکا لگ گیا ہو۔ ڈاکٹر نے بتایا موت دو تین بجے کے درمیان ہوئی اور نیند کی گولیاں زیادہ مقدار میں معدے میں پہنچ جانے سے یہ واقعہ عمل میں آیا۔

مسز نعمان کی موت سے سارے شہر میں کھلبلی مچ گئی۔ ان کے ملنے جلنے والوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ اس کے علاوہ وہ مزدور طبقے میں سوشل ورک کے سلسلے میں آیا جایا کرتی تھیں۔ تعلیم نسواں کی زبردست حامی عورتوں کے حقوق کی علمبردار۔ ان کی اچانک اور بے وقت موت سے کتنے ہی اسکول بند ہو گئے مہینوں تعزیت کے جلسے ہوتے رہے

اللہ نے مسز نعمان کو کیا نہیں دیا تھا۔ لکھ پتی باپ کی اکلوتی بیٹی، حسین، تعلیمیافتہ جوں ہی کالج سے بی اے کر کے نکلیں۔ عاشقوں کے کیو (Q) لگ گئے۔ مسز نعمان بچپن ہی سے بلا کی ذہین تھیں۔ ٹینس کی اچھی کھلاڑی۔ اوّل درجے کی شہسوار تیراکی

میں کتنے کپ جیت چکی تھیں۔ ستار تو ایسا بجاتی تھیں کہ استاد ولایت حسین کا شبہ ہوتا تھا۔ بلا کی خوش گفتار جس محفل میں چلی جاتیں لوگ مرعوب ہو جاتے جو ان سے ملتا۔ اس کا دل مٹھی میں لے لیتیں۔

جس زمانہ میں مسلم لیگ نے زور پکڑا وہ کانگریس سے الگ ہو کر دھواں دھار تقریروں سے لیگ کی حمایت کرنے لگیں۔ دن رات اس جانفشانی سے انھوں نے تحریک میں حصہ لیا کہ لوگ عش عش کرنے لگے۔ کسی زمانے میں پردے کی مخالفت میں جو عورتوں نے احتجاج کیا تھا مسز لغمان پیش پیش تھیں۔ وہ ان چند خواتین میں سے تھیں جو پردے کی لعنت کو دور پھینک کر میدان عمل میں آئی تھیں۔

جس صوبے میں ڈپٹی لغمان تعینات ہو کر جاتے۔ اس کی قسمت جاگ پڑتی۔ جاتے ہی مسز لغمان کلب اور مختلف کمیٹیوں کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھال لیتیں۔ عوام کی عافیت سدھارنے کا تو انھیں جنون تھا مسز لغمان کا دست راست صحیح معنوں میں وہی تھیں۔ مہماندار اس غضب کی کہ بڑی سے بڑی پارٹیوں کا انتظام کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ مسز لغمان دلو قسم کے انسان تھے۔ اگر ان کی شریک حیات اس قدر لائق فائق نہ ہوتی تو وہ کبھی یوں ترقی نہ کر سکتے اور سوسائٹی میں ان کی وہ پوزیشن نہ ہوتی جسے لوگ رشک کی نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے اعلیٰ عہدہ بھی مسز لغمان کے طفیل یا ان کے باپ رسوخ کی بدولت ہی ملا تھا ورنہ وہ اپنی بچپن کی منگیتر عائشہ بیگم کو نہ چھوڑ دیتے۔

عائشہ بیگم نے مسٹر لغمان کی شادی کے بعد کنوارپن کی قسم کھالی تھی، وہ ایک سکول میں معلمہ تھیں۔ ماں باپ کے انتقال کے بعد انھوں نے سکول کے احاطے ہی کو اپنا گھر بنا لیا تھا۔ جہاں وہ ایک خشک اور نیم مردہ زندگی گذارتی تھیں۔

دل کے معاملے میں بھی مسز لغمان بڑا لفیہ لیکر آئی تھیں۔ ان کے دوستوں کے حلقے میں ان کے عاشقوں کا بھی ایک وسیع حلقہ تھا کسی زمانے میں مسز لغمان حسن کا بہترین نمونہ سمجھی جاتی تھیں کالج کے زمانے میں کئی نوجوانوں نے ان کے عشق میں گھٹ کر خودکشی کر لی تھی ان کے زمانے

کے ترقی پسند شعراء انھیں کے حسن سے متاثر ہو کر ادب کی بلندیوں کو پہنچ گئے۔ کتنے ہی افسانہ نگاروں کے ہاں ان کی شخصیت کے عکس نے جان ڈال رکھی تھی۔ کتنے ہی گم نام عاشقانہ خط ان کے نام آیا کرتے تھے جو ایک مجموعہ کی صورت میں شائع ہو کر کافی مقبول ہو چکے تھے۔ بعض چھچھورے حاسدوں کا کہنا تھا کہ یہ خط خود مسز نعمان نے لکھے تھے۔ خیر اس بے بنیاد الزام کو مان بھی لیا جاتا تو بھی یہ خط ادبی جواہر پاروں کا درجہ رکھتے تھے۔ اور صرف یہ ظاہر کرتے تھے کہ جملہ اور خوبیوں کے مسز نعمان ایک اعلیٰ پیمانہ کی ادیبہ بھی ہیں۔

مختلف قسم کے سوشل کاموں میں وہ تعلیم نسواں پر زور دینے کے علاوہ کم بچے پیدا کرنے کا پرچار بھی کیا کرتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہمارے ملک کی ابتری کے رستے بڑے ذمہ دار یہ درجنوں بچے ہی ہیں۔ یہ غربت کی پیداوار ہیں۔ اور غربت ان سے پروان چڑھتی ہے۔ صرف جاہل اور گنوار عورتیں اس شدت سے بچے جنتی ہیں۔ اس لئے بچے جہالت اور گنوارپن کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ مہذب عورتوں کے کیوں لشتم پشتم بچے نہیں ہوتے۔

مجھے یاد ہے میری دس بچوں والی اماں مسز نعمان سے بہت ڈرا کرتی تھیں۔ ان کی جہالت کا جیتا جاگتا ثبوت یعنی ہم دس موٹے تازے بچے مسز نعمان سے کنی کاٹا کرتے تھے۔ ہمارے میلے گھٹنے اور پھوڑوں سے لدے پیر دیکھ کر وہ کانپ جایا کرتی تھیں۔ ہماری چیخ پکار سے ان کے سر میں دھمک پہنچتی تھی۔ اور ہمارے ندیدے پن سے دسترخوان پر ابکائی آنے لگتی تھی۔ مگر ان کی عادت تھی کہ بنا اطلاع کے نازل ہو جایا کرتی تھیں۔ اماں کا جی چاہتا شرم سے ڈوب مریں۔ ہم احمقوں کی طرح انھیں چاروں طرف سے گھیر کر تکنے لگتے۔ کچھ منہ چلے کہا کرتے تھے۔ مسز نعمان بانجھ ہیں۔

ان کے جانے کے بعد کئی دن تک اماں پر ہم لوگوں کی صفائی کی دھن سوار رہتی۔ ہماری سڑی سڑائی ناکوں کو چمٹے سے دھمکیاں دی جاتیں۔ جوتے عذابِ دوزخ کی طرح پیروں میں جکڑ دیئے جاتے۔ مار پٹائی کی سختی سے ممانعت ہو جاتی۔ آخر اماں کا پھوہڑپن ہماری حمایت کو ابھر آتا اور ہم پھر آزاد ہرنوں کی طرح قلانچیں بھرنے لگتے۔

لاکھ مسز نعمان نے اماں کو ہم لوگوں کے نزول کو روکنے کی ترکیبیں بتائیں مگر

ہمارے ابا نہ جانے کس قسم کے انسان تھے، ان کی مدد کے بعد بھلا کامیابی کیسی ہو سکتی تھی۔ ان کا بس چلتا تو وہ ہم لوگوں کو جڑواں منگواتے۔ ہم لوگوں کو یہ جنگلیوں جیسی آزادی بھی انھیں نے دے رکھی تھی۔

بڑے لوگوں کے دشمن بھی بہت ہوتے ہیں مسز نعمان کی اس ہر دلعزیزی سے بہت سے حاسد لوگ جل کر طرح طرح کی باتیں کیا کرتے تھے منہ پہ کہنے کا کسی میں دم نہ تھا۔

"سنا آپ نے لوگ کتنے چھچھورے ہیں۔" وہ ہنس کر خود کہا کرتیں۔ "نعمان صاحب کو تو آپ جانتی ہیں۔ سچ بتایئے کیا وہ اتنے ذلیل ہو سکتے ہیں۔؟"

"نہیں بہن، لوگ اڑاتے ہیں بے پر کی۔" اماں ہاں میں ہاں ملاتیں۔ "بہن وہ تو آپ کے دیوانے ہیں اور کیوں نہ ہوں، کون سی وہ خوبی ہے جو آپ میں نہیں۔ لائق فائق۔ اگر آپ جیسی بیویاں ہو جائیں تو اللہ قسم ہمارا ملک اتنا پچھڑا ہوا نہ رہے۔" اماں رٹا ہوا سبق دہراتیں۔ "نہیں بہن، میں کند ہ ناتراش، میں کس قابل ہوں۔" وہ بڑے انکسار سے کہتیں۔

"آپ تکلف کرتی ہیں، ورنہ بہن، شہر کی صورت آپ کے آنے سے بدل گئی۔ کس قدر جہالت تھی عوام میں۔" اماں اس نئے مضمون سے اقتباس کرتیں جو لوکل اخبار میں حال ہی میں نکلا ہوتا۔ "تعلیم نسواں تو آپ کے آنے سے پہلے بالکل ہی ردی حالت میں تھی۔ اماں مسکہ لگاتیں۔ تاکہ مسز نعمان کا دھیان بٹا رہے اور مرغیوں کے پیچھے دوڑتے ہوئے بد ذات بچوں کو نہ دیکھیں جنھیں وہ اشارے سے غارت ہو جانے کو کہتی جاتی تھیں۔ اگر ہم لوگوں کو دیکھ لیتیں تو سارے سدھار چھوڑ کر وہ ہمارے سدھار پر کمر کس لیتیں اور پھر ہماری ناکوں پر ستم ٹوٹتا۔

"اللہ قسم کبھی کبھی تو آپ کے بھائی کی محبت سے جی اکتانے لگتا ہے یہ بھی کوئی بات ہے، جس دن ڈنر پر میں موجود نہ ہوں بھوکے سو رہتے ہیں۔" اماں جانتی تھیں کہ یہ گپ ہے۔ مگر وہ خواب میں بھی مسز نعمان کی مخالفت نہ کر سکتی تھیں۔ انھیں کوئی

اپنی عاقبت میٹی میں ملانی تھی۔ پر نہ جانے کیسے منہ سے نکل گیا "کہیں اور کھا آتے ہوں گے"۔ کہہ تو دیا پھر جلدی سے سہم کر کہنے لگیں "لوگ اڑاتے ہیں بہن ....."

"لوگوں کو تو سفید کپڑوں پر کیچڑ اچھالنے میں مزہ آتا ہے۔ یہی ذلیل ذہنیت تو ہے جس نے ہماری قوم کو اتنا جاہل، کند ذہن ناتراش بنا رکھا ہے۔ مسز نعمان جس اعلیٰ کردار کے انسان ہیں، دنیا جانتی ہے۔ بھلا بیوی سے کوئی دل کی بات چھپا سکتا ہے۔ اگر خدانخواستہ کوئی بات ہوتی تو مجھ سے نہ چھپتی"۔ انھوں نے اماں کی طرف دیکھا "بہن آپ تو بڑی بھولی ہیں۔" ان کا کہنے کا مقصد تھا آپ تو کوڑ مغز ہیں، نری گاؤدی۔ مگر نعمان صاحب مجھ سے کوئی بات نہیں چھپا سکتے"۔

"ہاں بہن بھلا آپ سے کوئی کیا کھا کے بات چھپائے گا"۔ اماں مان گئیں۔

"اور لوگ کہتے ہی ہیں تو کس کے لئے۔ عائشہ بیگم کے لئے۔ دیکھا ہے آپ نے عائشہ بیگم کو؟"

"ہاں سوکھی کھٹائی توبہ"۔

"نہیں بہن آدمی کا بچہ ہیں۔ کان پکڑ کر کہتی ہوں، خدا برا بول نہ بلوائے، میں خود صورت نہ شکل بھاڑ میں سے نکل ... مگر ... توبہ ان کے چہرے پر تو بس"۔

"محرم سوا رہتے ہیں۔"

"کیا نامرادی ٹپکتی ہے۔"

"مرد کا پیار نہ ملے تو عورت کی صورت پر پھٹکار برسنے لگتی ہے۔"

"ہے ہے یہ عمر بھر کا کنوارپن بھی صورت کو مسخ کر دیتا ہے"۔

دیر تک اماں اور مسز نعمان بیٹھ کر طبی اور معاشرتی اصولوں کا حوالہ دیکر عائشہ بیگم کے چہرے کی ازلی نامرادی پر تبصرہ کرتیں۔ توبہ توبہ کرتی جاتیں، اور مسز نعمان کی گفتگو عروج پر پہنچ جاتی۔

"خیر اب تو بے چاری گئی گزری ہوئیں۔ ویسے وہ آپ کی پاسنگ بھی تو کبھی نہ تھیں۔ ہوتیں تو بچپن کی منگیتر کو چھوڑ کر آپ کا کیوں دم بھرنے لگتے۔ لوگ کہتے ہیں کہ

ڈپٹی کلکٹری کے لالچ میں لقمان صاحب نے انھیں چھوڑ دیا۔" اماں بعض وقت بھولپن میں ایسی بھونڈی باتیں کہہ جایا کرتی تھیں۔

"یہ سراسر بہتان ہے بہن۔" مسز لقمان بگڑ جاتیں۔ "لقمان صاحب آخر اتنے بڑے لشکر کو کیسے پال سکتے تھے۔ ان کے رشتہ داروں نے یہ باتیں اڑائی ہیں۔ آپ ہی سوچیے، آدھی درجن بہن بھائیوں کا بار کوئی مذاق ہے۔ عائشہ بیگم خاندان کی لڑکی تھیں۔ بس خاندان والوں نے ہمیشہ ان کی طرفداری کی۔ مگر سچ تو یہ ہے بہن، عورت میں خود ہی دم نہ ہو تو اس کے حقوق کی کون حفاظت کر سکتا ہے۔ اگر اتنی کشش ان میں ہوتی تو لقمان صاحب کیوں انھیں ٹھکرا دیتے۔"

"اللہ کی دی ہوئی صورت ہے بے چاری کی۔" اماں کہتیں۔

"اللہ نے صورت دی ہے پر ساتھ ساتھ عقل بھی تو دی ہے۔ رکھ رکھاؤ اوڑھنا پہننا بھی تو کوئی چیز ہے۔ سلیقے سے آرائش کی جائے تو معمولی شکل و صورت بھی حسین معلوم ہونے لگتی ہے۔ ویسے بات چیت کا بھی تو سلیقہ نہیں ان میں بھئی کسقدر بور ہیں عائشہ بی۔ سچ بتائیے اُن کی باتوں میں کچھ جان ہے۔ کچھ بھی دلچسپی ہے۔"

"نہیں بہن میرا تو دم بولا جاتا ہے ان کے پاس جیسے چپ کا روزہ رکھا ہے۔"

"یورپ وغیرہ میں تو باقاعدہ اس قسم کے اسکول ہیں جہاں عورت کو مرد کے لئے جاذب نظر بننا سکھایا جاتا ہے۔ جب ہی تو ہم ساری دنیا سے پیچھے ہیں۔" مسز لقمان کا لیکچر شروع ہو جاتا۔

ایک دن مسز لقمان اماں کے کان کچھ عورت کی خودداری اور عورت کے حقوق کے لئے ایسے بھر گئیں کہ وہ ابا سے کہنے لگیں "یہ آپ انگریز عورتوں سے ایسے ہنس ہنس کر بات کیوں کرتے ہیں؟"

"چلو تم ابھی میرے ساتھ۔ تم اُن کے مردوں سے ہنس ہنس کے بات کرو۔" ابا کڑک کر بولے

"ہے ہے۔ توبہ۔" اماں نے سر پیٹ لیا اور اس دن سے حقوق زوجیت جتانے کی ہمت نہ پڑی۔

مسز نعمان کبھی خود ہی نعمان صاحب کو چھیڑا کرتیں۔ "آپ نے بے چاری کی زندگی تباہ کر دی۔" مگر وہ ہنس کر ٹال دیتے۔

"بے چاری مجھے پانی پی پی کر کوستی ہوں گی۔" نعمان صاحب کے چہرے پر ندامت کی جھلک آجاتی۔

"سچ بتایئے کیا عائشہ بیگم آپ کو بچپن ہی سے ناپسند تھیں۔"

"کچھ ایسی ہی بات تھی۔" وہ پھر ٹالنا چاہتے۔

"تو کیا خاندان والوں کی زبردستی سے منگنی کر لی تھی۔"

"مجبوری انسان سے سب کچھ کرا لیتی ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر مسز نعمان کے بالوں سے کھیلنے لگتے۔

"مرد کتنے دھوکے باز ہوتے ہیں۔" وہ مسٹر نعمان کی محبت میں جھوم اٹھتیں۔ مسٹر نعمان سہم کر جلدی جلدی سگار کے کش لیتے ہوئے مڑ جاتے۔

مسز نعمان کا دل ایک بہتا ہوا دیا تھا۔ جس میں سارے جہاں کا درد تھا۔ عائشہ بیگم پر تو انھیں بے پناہ ترس آتا تھا بیچاری کی ڈپٹی کلکٹر سے شادی ہوتی، .... تو کس ٹھاٹ سے رہتیں، ڈنر پارٹیاں، ایٹ ہوم، مگر بیچاری خاک کنٹرول نہ کر پاتیں۔ گھر بچوں سے پاٹ دیتیں۔ مسز نعمان نے کم از کم اس علت سے تو گھر کو پاک رکھا تھا۔

"ہندوستان میں اتنے بچے ہیں کہ وہ عورت جو بچے نہیں پیدا کرتی ملک اور قوم کی سب سے بڑی خدمت کرتی ہے۔" ان کا قول تھا۔

مگر یہ سوچتے وقت وہ یہ بھول جاتی تھیں کہ اگر عائشہ بیگم کی شادی نعمان صاحب سے ہوتی تو آج وہ بھی کسی اسکول میں ماسٹری کر رہے ہوتے۔ اسکول کے معائنے کے سلسلے میں کبھی کبھی عائشہ بیگم سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ ظاہر ہے کہ عائشہ بیگم ان سے جلتی ہوں گی۔ حالانکہ اس میں نہ ان کا قصور تھا نہ نعمان صاحب کا۔ ایک جھجھکتے چاند کو چھوڑ کر آخر وہ کیسے سوکھی مریل کھٹائی پھاٹک پر ریجھ جاتے۔

لوگوں کا کہنا ہے کہ جلسے کی صدارت کرنے کے بعد وہ اسکول کے احاطے میں

نگاری کے موجد تسلیم کئے گئے۔ پریم چند اُردو ادب میں ناول نویس اور افسانہ نگار دونوں کے نام سے بہت مشہور ہیں۔ انھوں نے پہلے افسانے بعد میں ناول لکھے۔ انھوں نے دیہاتی زندگی کی بڑی دل آویز مرقع کشی کی ہے۔ دیہاتیوں کے رہن سہن، آپس کے جھگڑے اور میل ملاپ کے خاکے اپنے ناولوں اور افسانوں میں بڑے سلیقے سے کھینچے ہیں۔ انھوں نے گرتوں کو سہارا بھی دیا ہے اور ان کی اصلاح بھی کی ہے۔ دیہاتوں کی سیاسی گتھیوں کو بھی سلجھایا ہے اور اقتصادی مسائل سے بحث بھی کی ہے۔ بالآخر ان ہی کے اصلاحی رنگ سے متاثر ہو کر سدرشن، اعظم کریوی، حامد اللہ افسر، نیاز فتح پوری، سجاد حیدر یلدرم، قاضی عبدالغفار، پروفیسر مجیب، اور حیات اللہ انصاری وغیرہ نے کامیاب افسانے لکھے۔ اسی ماحول میں ترقی پسند ادب کی تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک کے آغاز سے اُردو ادب کے لئے نئے راستے کھل گئے۔ صحیح معنوں میں اگر دیکھا جائے تو اس سے افسانہ نگاری کے فن کو بڑا فائدہ پہنچا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں اُردو اخبارات و رسائل کے اجرا سے بھی مختصر افسانوں کی مانگ خاطر خواہ بڑھ گئی۔ لوگ کم سے کم وقت میں ضخیم داستانوں اور ناولوں کو چھوڑ کر افسانوں سے لطف اندوز ہونے لگے۔

زیر نظر کتاب ۱۹۵۸ء کے بہترین افسانوی ادب کا ایک انتخاب ہے۔ اس مجموعے میں گیارہ مشہور افسانہ نگاروں کی تخلیقات شامل ہیں۔ اس میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ سال کے بہترین افسانے ایک جگہ جمع ہو جائیں تاکہ پورے ایک سال کے افسانوی ادب کی رفتار اور ترقی کا جائزہ لینے میں آسانی ہو لیکن انتخاب کا کام جتنا اہم اور ضروری ہے اس سے کئی گنا مشکل بھی ہے۔ آپ کسی انتخاب کو لے لیجئے اس میں کچھ نہ کچھ خامی ضرور ملے گی اور یہ دعویٰ کرنا بھی مشکل ہے کہ اس میں کسی اور افسانے کی گنجائش نہیں۔ ممکن ہے بعض اچھے افسانے منتخب ہونے سے رہ گئے ہوں لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ انتخاب سال کے بہترین افسانوی ادب کی نمائندگی کر سکتا ہے۔ میں نے ہندو پاک کے

عائشہ بیگم کے کوارٹرس کی طرف چلی گئیں۔

"چائے نہیں پلائیں گی؟" انہوں نے حسب معمول خندہ پیشانی سے کہا تو عائشہ بیگم سب کو بٹھا کر خود چائے بنا کے لے آئیں۔ مسز نعمان انہیں چھیڑا تو ہمیشہ کرتی تھیں۔ اس دن بھی کہنے لگیں۔

"بہن ہم نے آپ کا منگیتر چھین لیا۔ مگر اس میں ہمارا کیا قصور تھا۔ عائشہ بی کھسیا کر مسکرائیں۔

"نہیں بہن آپ کا قصور کیوں ہوتا۔"

"آپ کو ہمارے اوپر غصہ تو بہت آیا ہوگا۔" مسز نعمان اور ہنسیں۔ عائشہ بیگم کا رنگ اڑ گیا، مگر بڑے ضبط سے بولیں۔ "غصے کی کیا بات تھی بیگم۔ سب قسمت کے کھیل ہیں۔"

"قسمت" ہنہ! وہی جاہلانہ باتیں۔ انہیں باتوں سے تو ہمارے یہاں کی نادان عورتیں اپنی دنیا دوزخ بنا لیتی ہیں۔ مرد عورت کو نامراد مسکتا چھوڑ جاتا ہے۔ اور وہ زبان پر تالا ڈال کر بیٹھ رہتی ہے۔" مسز نعمان نے لکچر بازی شروع کر دی۔ اس دن شاید عائشہ بیگم کسی خراب موڈ میں تھیں، نہ جانے مسز نعمان کے مذاق پر کیوں چراغ پا ہو گئیں۔ سر سے پیر تک تھر تھر کانپنے لگیں سکتے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"چھیننے کی بھی خوب کہی، بیگم کیا انسان بھی مٹی کا کھلونا ہے جو اسے کوئی چھین لے جائے جسم چھینا جا سکتا ہے مگر دل نہیں چھینا جا سکتا۔"

"ارے واہ آپ تو خاصی فلسفی معلوم ہوتی ہیں۔ عائشہ بیگم یہ خالی خولی محبت۔۔۔"

"محبت خالی خولی نہیں ہوتی بیگم۔۔۔۔۔ محبت زندگی کا سب سے بڑا سودا ہے۔"

مارے غصہ کے عائشہ بی کے ہاتھ پیر بے قابو ہو گئے۔ "آپ بڑی نادان ہیں بیگم۔"

مسز نعمان اور ہاں کے حوالی موالی ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ مسز نعمان اور نادان یہ خوش!" عرفان۔۔۔۔۔ مت بیٹا عرفان!" عائشہ نے چیخ سے جھانک کر پکارا اور ایک سولہ سترہ برس کا لڑکا ہاتھ میں ریکٹ لئے آن کھڑا ہوا۔

ادھر آؤ بیٹے۔ خانہ کو آواز دو۔

"مسز نعمان کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹ پڑی۔ ان کے سامنے۔۔۔

پہلے کے نعمان صاحب کھڑے تھے۔ اور عائشہ بیگم اس کے گھنے بالوں کو بکھیر کر کہہ رہی تھیں۔

"میری مرحومہ بہن کی نشانی ہے۔ آداب کرو بیٹا۔"

لوگ چہ میگوئیاں کرتے ہیں کہ عائشہ بیگم نے مسز نعمان کو زہر دے دیا۔

پاندان

بنّے میاں کل پھر آئے تھے۔" بڑی بیگم نے چھالیہ کترتے کترتے آہستہ سے کہا۔
اشرف میاں اخبار میں ایسے منہمک تھے کہ انھوں نے بڑی بیگم کی بات پر کان ہی نہ دیئے۔
بڑی دیر بعد پڑھتے پڑھتے اک دم اچھل کر بولے ـــــ "ابھی تم نے بنّے کا نام لیا تھا؟؟"
"بڑی بیگم نے سر اس انداز سے جھکا لیا جیسے کہتی ہوں "جی ہاں"
"اور صاحب زادی کہاں تھیں بے ـــ؟" انہوں نے تیز ہو کر پوچھا۔
اب بڑی بیگم کی مِل گئی۔ "دونی صاحب زادی کہاں تھیں ـــ؟ خود انہوں نے ہی بنّے میاں کو لا کر اپنے کمرے میں بٹھایا۔ کرین سے کہہ کر چار بنوائی اور خود ہی ان کے سامنے کھڑے ہو کر پیالیوں میں انڈیلی ـــ میں ادھر سے گذری تو کیا دیکھتی ہوں کہ چائے کی چسکیاں بھری جا رہی ہیں۔ اور مزے مزے میں ہنس ہنس کر باتیں ہو رہی ہیں۔
اشرف میاں نے بھنّا کر اخبار اتنی زور سے پھینکا کہ وہ بجائے میز پر ٹکنے کے زمین پر جا پڑا ـــ
"اور تم نے کچھ بھی نہ کہا ـــ؟؟"
لے لو ـــ بھلا میں کہتی ـــ کچھ صاحب زادی میرے ہاتھ کی ہیں؟ اب تو زمانہ ہی الٹا ہو گیا ہے کہ بجائے اس کے چھوٹے بڑوں سے ڈریں۔ الٹے بڑے چھوٹوں سے کانپتے ہیں ـــ کیا میری مت ماری گئی تھی کہ دو بول بول کر ان سے منہ باتیں سنتی ـــ؟؟"
"منہ باتیں کیوں سنتیں ـــ کیا تم ان کی ـــ وہ کچھ دیر رک کے پھر اسی تیزی سے بولنے لگے ـــ کیا تم ان کے بزرگ نہیں ہو؟"
"اے ڈالو چولہے میں ایسی بزرگی کو ـــ جب وہ باپ کا ڈر نہیں مانتیں تو ہم تو

تیسرے کونے پڑے ہیں۔"

"تیسرے کونے کیوں ـــ ؟ کیا تم اس کی خالہ نہیں ہو۔ ؟ ؟"

"اونہہ ـــ انہوں نے زور سے سر ونہ تخ دیا ـــ ایسا ہی بڑا خالہ کا مان ہوتا تو یوں کھلے خزانے ـــ" وہ بڑے ڈرامائی انداز سے جملہ ادھورا چھوڑ خاموش رہ گئیں۔

"کیا ـــ کیا بات ہے ـــ" اشرف میاں بڑی بے تابی سے بولے۔

"دوئی بات کیا ہوتی ـــ ہمارا تمہارا ڈر ہوتا تو یوں آپو آپ اپنے دیدوں اپنا بَر نہ ڈھونڈتیں۔"

سادا معاملہ اشرف میاں کی سمجھ میں آگیا۔ پٹھانی خون جوش کھا گیا۔ سرخ پڑ کر بولے۔ "یہ بالشت بھر کی چھوکری سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو ـــ ؟ اس کا دانہ پانی نہ بند کر دیا تو کہنا ـــ سنو جی اب سے بڑے دروازے کو قفل ڈال کے رکھنا ـــ ایک چابی تمہارے پاس ـــ ایک چابی میرے پاس ـــ جس کو بھی باہر جانے کا کام پڑے ہم دونوں میں سے کسی سے پوچھ کر جائے۔ سمجھ گئیں نا" ؟

بڑی بیگم ہول گئیں ـــ "دوئی کیسی بات کرتے ہیں آپ ؟ جوان دیجی پہ یوں پابندی ؟ کبھی جان پر کھیل گئی تو ؟

اجی بہت دیکھے ہیں جان پر کھیلنے والے۔" اشرف میاں تاؤ میں آکر بولے۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ ذرا رک گئے۔ "کیا کہا تم نے ابھی ـــ ؟ وہ انگلی اٹھا کر بولے۔

"کہتی کیا ـــ ؟ یہی کہ جان وان پر نہ کھیل جائے۔"

اشرف میاں کو خیال آیا کہ رضیہ ان کی کتنی لاڈلی ہے۔ کیسے اس کی زندگی سے ان کی اپنی زندگی ہے ـــ اور رضیہ کی ماں کی موت کے بعد سے تو وہ رضیہ پر یوں بھی زیادہ ہی جان چھڑکنے لگے تھے۔ ـــ ویسے پہلے ہی رضو سے وہ کیا کم محبت کرتے تھے۔ مگر اس کی ماں کی موت نے تو انہیں رضیہ کا ہی بنائے رکھ دیا۔ اور یوں تو چار بیٹوں پر بیٹی ہو تو اس کے لاڈ پیار کا کیا کہنا !

رضیہ جب ایک ماہ کی تھی تو یہ اس کی ننھی ننھی گدگدی گلابی انگلیاں اپنے ہونٹوں میں

دبا لیتے اور کھل کھلا کر ہنسے جاتے ـــــ اور جب چھ ماہ کی ہوئی تو اسے تکیوں کا سہارا دیکر مونڈھے میں بٹھا دیتے اور خود اس کے سامنے شیر بن کر ہاتھ پیروں کے سہارے چلا کرتے ـــــ اس کے معصوم قہقہوں سے سارا گھر کھل کھلانے لگتا۔ پھر ایک سال کی ہوئی تو یہ اپنے ہاتھوں اسے سہارا دے کر چلایا کرتے۔

پاؤں پاؤں سونے کے پاؤں
رانی جاتی راجہ کے گاؤں

وہ ٹھمک ٹھمک کر چلتی اور ان کے دل میں پھول چٹکتے جاتے۔ پھر یونہی ماہ و سال گذرتے رہے۔ اور پھول چٹک چٹک کر گلزار ہوتے رہے ـــــ جب رضیہ اٹھارہ سال کی ہوئی تو ایک دن چپکے سے اس کی ماں نے آنکھیں موندلیں۔ ـــــ معمولی سا میعادی بخار تھا۔ مگر جس کی پوری ہو گئی ہو اسے تو معمولی سا بہانہ ہی کارگر ہو جاتا ہے۔

اشرف میاں کی دنیا لٹ گئی ـــــ

کہاں تو وہ زندگی کہ گھر بھرے میں خوشیاں ہمکتی تھیں ـــــ دن رات قہقہے اچھلتے تھے ـــــ یا اب یہ عالم کہ رضیہ گھٹنوں میں سر دبائے جو بیٹھی ہے تو ادھر کا سورج اُدھر ڈھل جائے اور اس کا سر نہ اٹھے ـــــ باپ اپنے دفتر کچہری کے کاموں کو بھول بھال جو ہاتھوں میں منہ چھپا کر بیٹھیں تو نہ کھانے کا خیال نہ پینے کی فکر ـــــ! ذکیہ بیگم کی اچانک موت نے رضیہ کی محبت ان کے دل میں دگنی تگنی کر دی ـــــ ہر بات میں رضیہ کا خیال ـــــ ہر وقت رضیہ کی فکر ـــــ خود اپنا یہ حال کہ سوکھ کے کانٹا ہوئے جا رہے ہیں۔ مگر رضو بی میں تو زندگی ہے ورنہ کچھ نہیں ـــــ رضیہ بی کا بی اے کا پہلا سال تھا ـــــ ابھی پڑھائی شروع بھی نہ ہوئی تھی کہ ماں کا غم سر پر آ پڑا۔ تعلیم و علیم کو بھول بھال بس اپنے کمرے میں پڑی پڑی چھکو پہکو روئے جاتیں۔ ادھر باپ بے حال۔ ادھر بیٹی تباہ ـــــ جانے بڑی بیگم نہ ہوتیں تو اس گھر والے کا کیا حشر ہوتا ـــــ؟

پُرسے کے لئے گاؤں سے ذکیہ بیگم کی رشتوں کی بہن رفیعہ بیگم آئی تھیں۔ شادی اور سہاگ کے کوئی سترہ سال بڑی امنگوں اور خوشیوں میں گزارے تھے۔ سات آٹھ سال بعد خدا نے ایک بیٹا بھی دیا تھا۔ اور بیٹا دے کر میاں چھین لیا۔ کوکھ ٹھنڈی کی تو سہاگ کی سرخی چھین لی۔ ــــ اوپر والا جو چاہے سو کرے ــــ آج کل کی بات بھی نہ تھی برس گزر گئے تھے مگر غموں کی راندی ہوئی تھیں، موت کی چوٹ ان کا دل بھی کھا چکا تھا۔ رضیہ کا غم بھی دیکھا نہ جاتا ــــ نہ وہ ہوتیں نہ رضیہ کی اشرف میاں کی زندگی ہوتی ــــ ان دونوں باپ بیٹی کا کیا تھا۔ ــــ؟ کچھ خبر ہی نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ اور کیا نہیں۔ ــــ اگر یہ کھانا پکوائیں تو پکے ــــ نہ کہیں تو دن دن بھر چولہے ٹھنڈے پڑے رہیں۔ کھانا میز پر لگ کر ٹھنڈا ہو چکا ہے مگر نہ یہ اپنی جگہ سے ہلتی ہیں نہ وہ ــــ چلو میز پر آ کر بیٹھ بھی گئے مگر نہ یہ نوالہ توڑتی ہیں نہ وہ ــــ

ایسے بھی کہیں زندگی گذاری جاتی ہے؟ وہ ہوتیں نہ دوبارہ سے اس گھر میں زندگی لوٹ کر آتی ــــ ایسے غیر محسوس طریقے پر وہ اس گھر کے ماحول میں رچ بس گئیں کہ ان کے بغیر اب پتہ بھی نہ ہلتا ــــ گھر کا انتظام آپی آپ ان کے ہاتھوں میں چلا گیا ــــ ادھر رضیہ کا دل بھی چنو کے ساتھ بہلتا گیا۔

دن اور رات کی سنگت نے یہ اب احساس مٹا دیا تھا کہ رضیہ کی کوئی ماں نہیں۔ ــــ بڑی بیگم ماں تھیں۔ اور ایسی ماں تھیں کہ اب ایک کی بجائے انہیں چھ چھ بچے تھے۔ لڑکوں کے دل میں پتھر تو نہیں ہوتا مگر لڑکیوں کے مقابلے ان کے دل ذرا سخت ہی ہوتے ہیں۔ بھائی پھر بھی بڑے بڑے تھے۔ اور دنیا کی اچھی خاصی سمجھ رکھتے تھے۔ ماں کا غم تو بس کچھ رضیہ کے جی کو ہی لگا ــــ بڑے دو بیٹے تو ماں کی زندگی میں ہی پاکستان سدھار چکے تھے۔ دو چھوٹے علی گڑھ میں تعلیم پاتے تھے جس وقت ماں مری بڑے بیٹے کوئٹہ میں تھے اور چھوٹے مری میں ــــ تار بھجوائے ضرور گئے ــــ مگر ماں کو مٹی دینا نصیب نہ ہوا ــــ

رضیہ نے دل توڑ غم سے آنکھیں کھولیں تو سامنے بس بڑی بیگم کو پایا۔ اور اب دن گزرنے پر تو وہ یوں سمجھنے لگی کہ گویا وہی اس کی ماں ہوں ___ کبھی بھول کر بھی خیال نہ آتا کہ ایک ماں تو خیر چھوڑ چلتی نہیں یہ بھی کبھی دور ہو سکتی ہیں۔

مگر ایک دن جب بڑی بیگم نے اپنا بستر باندھتے ہوئے جانے کا اعلان کر دیا تو رضیہ کے ہاتھوں سے کتاب چھوٹ گری۔ ___

"آپ جا رہی ہیں خالہ بی ___" اس نے کھوئے کھوئے انداز سے پوچھا۔

"اور کیا بیٹا کوئی کسی کا عمر بھر کا ساتھ تھوڑے ہی دے سکتا ہے، بس اوپر والے کی نگاہ رہے،" انہوں نے ہولڈال کے بند کستے ہوئے بڑی رقت بھری آواز سے کہا۔

"اور پھر یہاں ہم لوگوں کا کیا ہوگا۔ ___؟" رضیہ نے بڑے دکھ سے سوال کیا۔

بڑی بیگم نے کوئی جواب نہ دیا۔

رضیہ نے اپنے آپ میں کہنا شروع کیا ___ "اچھا ہے بھائی صاحب اور بھائی جان تو پاکستان میں خوش ہیں۔ الطاف بھائی اور چھوٹے بھیا ہوسٹل میں مگن ___ ایک ہم بدنصیب ہیں ___ او نہ مرے تو کیا جیئے تو کیا۔ ___!"

بڑی بیگم نے ذرا کرب سے اس کی طرف دیکھا۔

"ووئی بی بی یہ منحوس باتیں کیسی کر رہی ہو۔"

چنو پاس بیٹھے اپنے چھوٹے ٹرنک میں کپڑے ٹھونس رہا تھا۔ وہیں سے چلا کر بولا۔ "تو پھر آپ رک کیوں نہیں جاتیں۔؟"

رضیہ چنو سے مخاطب ہو گئی ___ "خالہ بی کو ہم سے محبت ہوتی تب رکتیں۔ ___ وہ تو۔ . . . ."

بڑی بیگم نے لپک کر اس کا منہ بند کر دیا ___ "تمہاری باتیں بھی نرالی ہوتی ہیں بی ___ میرا کون ہوتا سوتا بیٹھا ہے جس میں اپنا جی اٹکاؤں گی ___"

ماں کی موت کے بعد سے رضیہ کے منہ پر ہنسی نہ آتی تھی ـــــ بس آنسو ہی آنسو تھے کہ امڈے آتے ـــــ بڑی بیگم نے بڑے دکھ سے رضیہ کو دیکھا۔

"میں چلی تو جاؤں مگر پھر کوئی تو نہ ہوگا کہ آنسو ہی پونچھ دے۔"

انہوں نے ہولڈال کے بند کھول دیئے۔

دن چیونٹی کی چال گزرنے لگا۔

بڑی بیگم رکنے کو رک تو گئیں مگر اپنے آپ میں کھسائے جاتیں۔ اگر رضیہ کے آنسوؤں کا واسطہ نہ ہوتا تو کبھی کا گھر چھوڑ چھاڑ کے چلی جاتیں۔ ـــــ اشرف میاں ایسی سیلڑی ناک کے تھے کہ کوئی چیز میاں کے من نہ بھاتی۔ پٹھان تھے اور گورے چٹے بھی۔ بات بات پر سرخ پڑ جاتے۔ خون جوش کھانے لگتا۔ بڑی بیگم کی مروت ماما کو تو کچھ سمجھتے ہی نہ تھے یوں ان سے برتاؤ کرتے جیسے یہ تو ان کا حق ہی تھا۔ انسان کچھ تو غیر اور اپنے والے میں تمیز رکھتا ہے۔ ـــــ مگر وہ تو ان پر اپنا حق سمجھے بیٹھے تھے۔ ـــــ مگر دن گزرے تو وہ بھی ان کے مزاج کی عادی ہوتی گئیں اور اب تو یوں ہونے لگا کہ وقت پڑنے پر خود اشرف میاں سے ضد کر کے اپنی بات منوا لیتیں۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

اشرف میاں شہر میں وکیل تھے۔ نام بھی بڑا تھا اور ساکھ بھی ـــــ خود بھی تعلیم یافتہ تھے۔ بیٹوں کو بھی تعلیم دلوائی، اور بیٹی کو بھی ـــــ پردہ جھر وہ برائے نام ہی تھا۔ روشن خیال لوگ تھے۔ پرانی باتوں کا چلن۔ ان کے ہاں نہ تھا ـــــ نہ رضیہ کو کسی بات پر پابندی تھی نہ کہیں آنے جانے پر روک ٹوک۔ کالج بھی جاتی تو کھلی موٹر میں ـــــ یوں خوبصورتی اور دکھاوے کو ریشمی پردے بھی پھڑ پھڑاتے تھے مگر ان سے پردوں کا کام نہ لیا جاتا ـــــ

ذکیہ بیگم شہر میں بیاہی گئی تھیں۔ جیسا ماحول انسان کو ملتا ہے اسی کا عادی ہو جاتا ہے۔ ذکیہ بیگم کا بھی وہی چلن ہو گیا جو ان کی سسرال کا تھا۔ بڑی بیگم رہیں گاؤں والی ـــــ یہاں آئیں تو عجب ترقی پسندی دیکھی ـــــ بولتیں تو کیا بولتیں؟ کچھ

اپنے گھر کی سی بات تو نہ تھی۔ پُرسے کو آتی تھیں۔ خواہ مخواہ گھر کے معاملات میں دخل اندازی کر کے نکّو کیوں بنتیں۔!

ایک دن بڑی بیگم پورچ میں کھڑی تھیں کوئی چار ساڑھے چار بجے ہوں گے کہ ایک دم موٹر آ کے رکی۔ رضیہ اتری۔ چہرے پر ہنسی بکھری ہوئی منہ تمتما رہا تھا۔

بڑی بیگم نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ماں کی موت کو اتنے دن گزر گئے تھے۔ کبھی بھولے بسرے بھی مسکراہٹ منہ پر نہ پھٹکی تھی۔ ــــ آج تو انگ انگ مسکرا رہا تھا۔ پیچھے پیچھے چلتی چلتی اس کے کمرے تک آئیں۔ رضیہ نے کتابیں میز پر پٹخ دیں اور ہنس کر بولی ــــ

خالہ بی آج کالج میں مشاعرہ تھا۔ بس مزہ آ گیا۔"

بڑی بیگم کو اس میں تو ہنسی کا کوئی پہلو ہی نظر نہ آتا تھا ــــ حیرت سے بولیں۔

ــــ "پھر؟"

"ارے خالہ بی بڑے اچھے اچھے شاعر آئے تھے۔ اس قدر ہنگامہ رہا آج ــــ آپ بھی چلتیں بڑا لطف رہتا ــــ"

"نہ بابا ــــ" خالہ بی کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔ ــــ "غیر مردوں کے سامنے جاتے بھلا کچھ اچھا لگتا ہے۔"

رضیہ زور سے ہنسی۔ "واہ خالہ بی یہ اچھی سنائی۔ پھر یہ تو دیکھئے کہ اتنے سارے لوگوں میں کون کسی کو دیکھت بیٹھتا ہے۔"

"ارے واہ دیکھتا کیسے نہیں نگاہ پڑ ہی جاتی ہے۔"

رضیہ کا چہرہ گلابی گلابی ہو رہا تھا ــــ "آپ بھی کیسی پرانے وقتوں کی سی باتیں کرتی ہیں ــــ اچھا دیکھئے کسی دن اپنے ہاں مشاعرہ منعقد کریں گے۔"

"نہ بی بی ــــ" بڑی بیگم ہول گئیں ــــ "ایسے غیر مردوں کا جھمگھٹ اپنے ہاں نہ لگا بیٹھنا ــــ خدا رسولؐ کا بھی کچھ خوف ہے کہ نہیں؟"

غیر مردوں کا جمگھٹ تو خیر وکیل صاحب کے ہاں نہ لگا مگر ایک دن رضیہ

کالج سے لوٹی تو اس کے ساتھ ایک نوجوان بھی بیٹھا ہوا تھا ـــــ گورا رنگ ـــــ بڑے بڑے سنہرے بال ـــــ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

ہنسی کی غیر مانوس آواز سن کر بڑی بیگم نے کمرے کی کھڑکی سے جھانکا ـــــ رضیہ موٹر کے دروازے میں اندر کی طرف سر ڈالے کھڑی تھی اور ہنسے جا رہی تھی۔

"اس دن آپ کی نظم تو واقعی سب پر چھا کر رہ گئی تھی ـــــ"

آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ ورنہ ایسی کوئی قابل تعریف نظم تو تھی نہیں۔"

ایک دلکش قہقہہ بلند ہوا ـــــ" اب یہ آپ کی کسر نفسی ہے ورنہ آپ خود جانتے ہیں کہ بار بار آپ کو پڑھوایا گیا۔ اور آپ نے جو رباعیاں پڑھی تھیں ـــــ وہ . . . اک دم وہ رک کر بولی ـــــ" ارے میں نے آپ سے یہ بھی نہیں کہا کہ اندر چل کر بیٹھئے۔ آپ بھی سوچیں گے میں کتنی بدتمیز ہوں ـــــ"

"اوہ ـــــ وہ مسکرایا ـــــ ایسی کوئی بات نہیں ـــــ اور موٹر سے نیچے اتر آیا ـــــ سفید قمیص ـــــ سفید پتلون ـــــ اونچا سا قد، ہنستا ہوا چہرہ ـــــ بڑی بیگم کو اس میں کوئی برائی نظر نہ آئی۔ مگر یہ کیا کم برائی تھی کہ رضیہ اس سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی ـــــ ایسے غیر مرد سے جو نہ ماں کا سگا نہ باپ کا سگا ـــــ توبہ ـــــ

رضیہ کے چہرے کی ویرانی اور وحشت اب دور ہو گئی تھی اور اس کی جگہ مستقل سرخی چھائی رہنے لگی ـــــ یا تو سدا خاموش خاموش رہتی تھی یا اب اپنے آپ میں مسکرائے جاتی، گنگنائے جاتی ـــــ

ایک دن رضیہ صبح سے جو کالج گئی تو شام تک نہیں لوٹی۔ رات کے کوئی دس ساڑھے دس کے اندازمیں موٹر کے گھڑگھڑانے کی آواز آئی اور موٹر پھاٹک میں داخل ہوئی ـــــ بڑی بیگم نے اپنے کمرے سے جھانک کر دیکھا ـــــ رضیہ اتر رہی تھی۔

سفید ساری ـــــ سفید بلاؤز ـــــ گھونگھریالے بالوں کے چھلے۔ اس کی پیشانی کے دونوں طرف جھک آئے تھے۔ اس نے ذرا آگے بڑھ کر کلائی پر بندھی ہوئی نازک سی